ادبیات پیر پنچال
جاوید انور
پیشکش
دبستان ہمالہ

ادبیات پیر پنچال

خطہ ٔپیر پنچال کے ادباء وشعرا (انتخاب وتعارف)

جاوید انور

خصوصی معاون

ڈاکٹر محمد سلیم وانی

(اسسٹنٹ پروفیسر، انگریزی)

پیشکش :

دبستان ہمالہ

ادارہ برائے فروغ زبان وادب

زیر اہتمام : ہمالین ایجوکیشن مشن ، راجوری (جموں وکشمیر)

نام کتاب: ادبیات پیر پنچال (خطہ پیر پنچال کے ادباء وشعرا "انتخاب وتعارف")
مصنف: جاوید انور

ADBIYAT-E-PEER PANCHAAL
(KHITTA-E- PEER PANCHAAL KE
ODABA-O-SHOARA"INTEKHAB-O-TA,AR,RUF")
by **Jawed Anwar**

پتہ: Urdu Ashiana 167,Afaq Khan Ka Ahata
Manduadih Bazar Varanasi-221103 (U.P)
موبائل: 9935957330, 8707516773

ضخامت: 312صفحات
طباعت: مہاویر پریس، وارانسی
کمپوزنگ وسرورق: عظمیٰ اسکرین، وارانسی Mob.: 9369138837
e-mail: uzmascreen_vns@yahoo.com
سن اشاعت: ۲۰۱۸
تعداد: ۱۰۰۰
قیمت: ۵۰۰/روپے
ISBN--978-81-931169-4-4
تقسیم کار:
Himalyan Education Mission Society, Ward No. 13, Rajouri
Cell: 09797316229
Asr Book Depot, Main Bazar rajouri

شریک حیات

ماہ طلعت

بیٹیاں

شازیہ زہرہ فاروقی

جاثیہ زہرہ فاروقی

انعمتہ زہرہ فاروقی

شگرف زہرہ فاروقی

جو میری کائنات ہیں

اور

شیر خوار بھتیجے

فرقان احمد فاروقی

کے نام

جو ہمارے گھر کا چراغ ہے

فہرست

پیشکش

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی ادبی خدمات کے حوالے سے میری دوسری کتاب ''ادبیات پیر پنچال'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ خاص خیال رکھا گیا ہے کہ یہ ہر اعتبار سے معیاری، منفرد ہوتا کہ اس خطہ کی ادبی سرگرمیوں کی آئینہ داری میں دستاویزی حیثیت کی حامل قرار دی جاسکے۔ میں ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کی تکمیل میں اپنے قیمتی وقت اور آرا سے نوازا۔ بھائی ڈاکٹر محمد سلیم وانی، مسلم وانی اور شہریار صاحبان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے کہ انہوں نے قدم قدم پر نہ صرف میری حوصلہ افزائی فرمائی، بلکہ لائبریری سے مواد کی فراہمی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

شیخ سجاد پونچھی صاحب، بھائی عرفان عارف اور بھائی عمر فرحت کا تشکر ممکن نہیں کہ یہ میرے ساتھ بستی بستی، صحرا صحرا، قریہ قریہ اور دریا دریا سفر کی صعوبتیں برداشت کر اہم شخصیات سے ملاقاتیں اور ان سے دستی طور پر تخلیقات حاصل کرنے میں پیش پیش رہے۔ نثار راہی صاحب کا تشکر لازمی ہے کہ انہوں نے کتاب میں شامل دوسری زبانوں کے کلام کے اردو تراجمے کئے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم اور ڈاکٹر لیاقت نیر صاحبان کا بھی مشکور ہوں کہ آخری فہرست ترتیب دینے میں ان کے مفید مشورے بڑے کام آئے۔ مہار گر سنگھ ایشر صاحب کا دل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ عالمی شہرت یافتہ اور ایوارڈ یافتہ ہوتے ہوئے بھی مجھ احقر کے لئے اپنے فن کے دروازے وا کئے اور اپنی فوٹوگرافی کے بہترین فن کو نمایاں کرتی ہوئی خطہ پیر پنچال کی چند نایاب تصاویر عنایت فرمائیں، جو اس کتاب کے آخر میں موجود ہیں۔ سب سے بڑھ کر فاروق مضطر صاحب کی کرم فرمائی ہے کہ ان کی سرپرستی، رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کار نیک ممکن ہی نہ تھا۔

جاوید انور
وارانسی
۶، اپریل ۲۰۱۸ء بروز جمع

ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی

جموں وکشمیر کی تاریخ میں جن چند تعلیمی، ادبی اور سماجی اداروں نے اپنی کارکردگی سے جموں وکشمیر کے بہترین مستقبل کے ضامن ہونے کا افتخار حاصل کیا ہے، ان میں ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی، راجوری کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے بانی محمد فاروق مضطر نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے نہ صرف اس ادارے کو عروج تک پہنچایا ہے، بلکہ ''تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش'' کے عین مطابق نئی نئی منزلوں کو سر کرتے جا رہے ہیں۔

فاروق مضطر فطرتاً ادیب، شاعر اور صحافی واقع ہوئے ہیں۔ مطالعے کا جنونی شوق انہیں ہمیشہ مضطرب رکھتا ہے، چاہے وہ ادبی کتب ورسائل کے مطالعے کا معاملہ ہو، دینی کتب کا یا پھر فرد، سماج، ملکی اور بین الاقوامی امور سیاست کا، ہر جگہ ان کا عمیق مطالعاتی ذہن سرگرم عمل نظر آتا ہے۔ ۸۰-۱۹۷۰ء کے درمیان کا زمانہ تھا، جب انہوں نے اردو ادب کی جانب خاصی توجہ کی۔ اپنی فطری جبلت کے مطابق انہوں نے اس دور کے ادبی رجحان کے نمائندہ رسالہ ''شب خون'' کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا، جس نے ان کی تخلیقی حسیت کو بہت متاثر کیا۔ اسی اثر نے ان سے پروفیسر ظہور الدین کی خواہش پر ''سنگ وآئینہ'' کے عنوان سے ۷ ویں دہائی تک کے جدید شعرا کی غزلوں کا انتخاب کروایا، جس کا پیش لفظ شمس الرحمن فاروقی نے لکھا تھا۔ اس انتخاب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں جموں وکشمیر کی ادبی دنیا کے نئے لکھنے والوں اور نئے رجحان کا بہترین تعارف بھی تھا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ جب یہ مسودہ اہم لوگوں کی نظروں سے گزر کر اور سب سے داد وتحسین وصول کر کے راجوری واپس آرہا تھا کہ اشاعت کے مرحلے سے دوچار ہو، تو اسے درمیان سے ہی غائب کر دیا گیا جس کے بارے میں فاروق مضطر صاحب گفتگو کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ''اداس نسلوں کی کہانی'' کے عنوان سے جدید افسانوں کا انتخاب بھی کیا تھا جو ۸۰-۱۹۷۰ء کے جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مشتمل

تھا لیکن شومہ قسمت کہ ان کا یہ خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے ذہن میں اپنے علاقے کی تعلیمی ابتری کو دور کرنے کا جو خاکہ عملی صورت اختیار کر رہا تھا، اس نے ان کے وقت کی ایک بڑی ترجیح ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی کے حصے میں ڈال دی۔ اور واقعی اس دور سے لیکر اب تک ان کے پاس دوسری سرگرمیوں کے لئے وقت کا فقدان بنا ہوا ہے۔ انہوں نے راجوری اور قرب وجوار کے لئے تعلیمی میدان میں جو کچھ کیا ہے، اس کی نذیر مشکل سے ملے گی۔ میں ان کی اس مستحکم مزاجی کا سبب بھی ان کی ادبی فطرت میں تلاش کرتا ہوں۔ جب کشمیر میں چند ادبا و شعرا ہی جدید رجحان سے واقف تھے، مضطر صاحب نے نہ صرف اسے راجوری میں متعارف کرایا بلکہ اس کے مطالعے کی جانب بھی لوگوں کو رغبت دلائی۔ اس کے علاوہ ان کے اسی جنون نے ان سے ''دھنک'' جیسا موقر جریدہ نکلوایا۔ ۷۴-۱۹۷۳ء میں اس کا پہلا شمارہ نکلا اور اردو ادب کی نظر میں آ گیا۔ دوسرے ہی شمارے سے اردو کے صف اول کے تخلیق کاروں کی تحریریں اس میں شامل ہونے لگیں۔ اسی دوران وہ لائبریرین کے عہدے پر فائز ہو گئے اور اپنی علمی تشنگی کو سیراب کرنے کے بھرپور مواقع نہیں میسر آئے۔ اسی درمیان جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی کے ینگ رائٹرس کے ایک پروگرام کے تحت انہیں علی گڑھ، دہلی اور دوسرے مقامات پر جانا ہوا تو ان سے پہلے بحیثیت تخلیق کار اور ''دھنک'' کے مدیر کی حیثیت سے ان کا تعارف پہنچ چکی تھا۔ ''دھنک'' کی اشاعت کے علاوہ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا ''نئے کلاسک'' پر تبصرہ اور دو افسانے (۱) سرابوں کا سفیر (ستاروں سے آگے، سورن کوٹ) (۲) ''بازیافت'' تحریک، دہلی میں شایع ہو چکے تھے۔

علی گڑھ میں آشفتہ چنگیزی، ابن فرید صلاح الدین پرویز اور فرحت احساس وغیرہ نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور ان کے اعزاز میں کئی پروگرام منعقد ہوئے۔ دہلی میں محمود ہاشمی نے ان کو پاکستانی ادب کے تعلق سے کئی کتابیں تحفے میں پیش کیں، جن میں سلیم احمد کی تنقیدی کتب بھی شامل تھیں۔ ان کے مطالعے نے ادبی اور تخلیقی ذہن کو مزید تابناک بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ''دھنک'' برابر نکلتا رہا اور اس کے ساتھ ان کا ادبی اور تخلیقی سفر بھی جاری رہا۔ ۱۹۷۸ء تک ''دھنک'' کے دس شمارے نکل گئے۔ اس کے بعد محمد فاروق مضطر کے اضطراب نے ان کے نصب العین کا رخ پوری طرح سے ہمالین ایجوکیشن مشن کی جانب موڑ دیا اور ادب سے ان کا رشتہ

فرد، سماج اور تعلیم کے سنجیدہ مطالعے تک استوار رہ گیا جو آج بھی جاری ہے۔اسی طرح دینی، سیاسی اور سماجی مطالعہ اور اس کا مشاہدہ بھی ان کے روزمرہ میں شامل ہے۔اسلام کا سائنسی مطالعہ اور اس کی صحیح ترجمانی کے سلسلے میں وہ مولانا وحیدالدین خاں سے بہت متاثر ہیں۔ان کے نزدیک ادب میں شمس الرحمن فاروقی اور دینی علم میں وحیدالدین خاں صاحب کے نظریات، کاوشیں اور خدمات نے ان کے لئے مشعل راہ کا کام کیا۔

''دھنک'' کے جو شمارے جو شایع ہو چکے ہیں، آج بھی ان کے پاس محفوظ ہیں۔ان کا ارادہ ہے کہ ان میں شامل مضامین کو یکجہ کر کے دوبارہ اپنے ادبی ادارے ''دبستان ہمالہ'' کے زیر اہتمام شائع کریں گے۔ان کے ادبی سفر کے سلسلے میں کئی واقعات خصوصیت کے حامل ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ دونوں کتابیں یعنی (۱) سنگ وآئینہ جو جدید شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر اور (۲) اداس نسلوں کی کہانی جو جموں وکشمیر کے جدید افسانہ نگاروں کے افسانوں کے انتخاب پر مشتمل تھی، ان کی اشاعت کے لئے کلچرل اکیڈمی جموں وکشمیر نے ٹھیک ٹھاک رقم منظور کر لی تھی لیکن دونوں شائع نہ ہو سکیں۔وہ ''ستاروں سے آگے'' سے بھی وابستہ رہے اور دوسرے ناموں مثلاً ابن العزیز سرحدی اور غزالہ مریم کے قلمی ناموں سے بھی لکھتے تھے اور خط وکتابت کرتے تھے۔ہندوستان کا شاید ہی کوئی جریدہ ہو جس سے ان کا قلمی تعلق نہ رہا ہو۔شہباز راجوروی کے متعلق ''عالم خیال میں شہباز راجوروی صاحب سے ایک گفتگو'' ان کی پہلی تحریر تھی جو ''ستاروں سے آگے'' میں شایع ہوئی تھی۔عتیق اللہ اور منیر نیازی سے بھی مضطر صاحب کے مراسم بہت اچھے تھے۔

ایک چھوٹے سے پرائمری اسکول کھولنے سے سفر شروع کرتے ہوئے اور ساتھ ہی ملازمت کی ذمہ داریوں اور عہدوں میں ترقی کرتے ہوئے کسی بڑے مقصد کو پالینا بہت مشکل کام ہے۔یہاں جس مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں علم وادب کے سنجیدہ مطالعے کے ذریعہ ادیب کے ذہن میں جو مستقل مزاجی نمو پاتی ہے، اس کا کردار بھی بہت اہم ہوا کرتا ہے۔محمد فاروق مضطر صاحب نے اپنے تخلص ''مضطر'' کی آئینہ داری کرتے ہوئے نہ صرف لائبریرین سے ہیڈ ماسٹر تک کا سفر طے کیا بلکہ ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی کا وہ مقصد جو ایک چھوٹی سی جگہ سے چھوٹے سے پرائمری اسکول سے شروع ہوا تھا، اسے پورا کرنے میں فاروق مضطر صاحب

کے تینوں فرزند ارجمند ڈاکٹر محمد سلیم وانی، محمد مسلم (ایم۔ایس ۔سی۔فزکس) اور محمد شہریار (ام۔سی۔اے) صاحبان نے اپنی پوری زندگی وقف کی ہوئی ہے۔اور اپنے والد محترم کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہمالین اسکول، ہمالین انٹر کالج، ہمالین کالج، ہمالین ڈگری کالج، ہمالین بی۔ایڈ کالج وغیرہ جن کی شاخیں راجوری اور قرب و جوار میں پھیلی ہوئی ہیں، مسلسل ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔اس نے جموں وکشمیر کو کئی آئی۔اے۔ایس، کے۔اے۔ایس، پی۔سی۔ایس، ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور دیگر شعبۂ زندگی کے ماہرین عطا کئے ہیں اور کر رہے ہیں جو ملک اور ملک سے باہر بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوار ہے ہیں۔

دبستان ہمالہ

''دبستان ہمالہ'' ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی کا ایک ذیلی تعلیمی ، ادبی ، ثقافتی اور دینی ادارہ ہے ، جس نے جموں و کشمیر کے ایک ایسے ادارے کی حیثیت اور وقار حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہے ، جیسا کہ اپنے زمانے میں دبستان دہلی ، دبستان لکھنو ، دبستان عظیم آباد اور دبستان لاہور وغیرہ کا ہوا کرتا تھا ۔ ادبی رسالہ ''دھنک'' کے ساتھ جو ادبی علمی مزاکرے اور مباحثے کا سلسلہ شروع ہوا تھا ، فکری اعتبار سے وہ مولانا وحید الدین خاں کے ساتھ مستحکم مراسم کی صورت اختیار کرتا گیا ۔ دبستان ہمالہ کے زیر اہتمام اکثر ہمالین ڈگری کالج کے بڑے ہال میں ادبی ، علمی ، فکری پروگراموں کے علاوہ مختلف قسم کے ثقافتی پروگرام بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں ۔

ثقافتی پروگراموں کے تعلق سے ملک میں بھائی چارہ ، آپسی اتحاد ، امن ، اور ان تمام میں بالخصوص جموں و کشمیر کی تہذیب ، اس کا تمدن کتنی اہمیت رکھتا ہے ، اس کا اندازہ ''دبستان ہمالہ'' کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے پروگراموں سے بخوبی ہو جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں دبستان نے طلبہ و اساتذہ اور پیر پنچال سول سوسائٹی کے ممتاز اہل علم و دانش ، ڈوگری ، گوجری ، کشمیری ، پہاڑی ، لداخی جیسی اہم زبانوں کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کے فروغ میں معاونت کرنے والے فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور ان کی خدمات کے اعتراف میں اعزازات اور انعامات کا اہتمام بھی کیا ہے ۔ فنکار جس کا تعلق تخلیقی فن سے ہو یا پھر فنون لطیفہ کے کسی بھی دوسرے شعبے سے ، جموں و کشمیر کے ادب ، آرٹ اور کلچر میں جو بھی شخصیت اپنی صلاحیتوں سے اضافہ کرتی ہے ، اس کے معیار و وقار کو بڑھاتی ہے ، ''دبستان ہمالہ'' اس کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتا ہے ۔

فکری سرگرمیوں کے حوالے سے دبستان ہمالہ کے وسیع وعریض کتب خانہ (لائبریری) میں اسلام کے متعلق دنیا بھر کے بے حد اہم اسلامی اہل علم کی اہم تصنیفات خواہ وہ دنیا کی کسی بھی بڑی زبان میں ہوں، ان کے انگریزی یا اردو تراجمے اور بعض کے ہندی تراجم بھی موجود ہیں۔ جلد ہی ''دبستان ہمالہ'' کے زیر اہتمام مختلف نویت کا ایک علمی وفکری رسالہ ''الفاروق'' جاری ہونے جا رہا ہے، جس میں مذہب اور سماج، اسلام اور سائنس اور دینی وملی اتحاد کے متعلق اہم مواد پڑھنے کو ملیں گے۔ اس کے علاوہ دبستان ہمالہ کے زیر اہتمام ایسے دینی مدارس کا قیام بھی عمل میں لانے کا ارادہ ہے جو ہر مسلک اور ہر مکتب کے نظریوں کو یکجہ کر کے ایک ایسے پلیٹ فارم کی شکل اختیار کرے، جن سے شیعہ، سنی، وہابی، دیوبندی، بریلوی وغیرہ ہر رجحان و نظریات سے تعلق رکھنے والے استفادہ کریں۔

ادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے جو سفر ''دھنک'' کے جاری ہونے کے ساتھ شروع کیا گیا تھا، اس نے کئی پڑاؤ سر کر لئے ہیں اور منزلوں در منزلوں کا سفر جاری ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

چار جانب اب کہ جو بکھرے جنوں کے قافلے
منزلیں در منزلیں تھیں، رہگزر کے درمیاں

دبستان ہمالہ نے سنجیدہ ادبی رسائل کے لئے امداد کے طور پر اشتہار دینے کا بھی ایک شعبہ قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ بے حد معیاری فن پاروں کی اشاعت میں اگر مالی معاونت درکار ہو تو اس کا اہتمام بھی دبستان ہمالہ کے مالی معاونت شعبہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دبستان ہمالہ کے زیر اہتمام اور اس کے تعاون سے ایک ادبی رسالہ ''سیاق'' بھی جاری ہے، جس کے مدیر جموں وکشمیر اور اردو ادب کے اہم نوجوان شاعر جناب شیخ خالد کرار ہیں۔ جدید رجحان کی آبیاری کرنے والا یہ موقر جریدہ اہل ادب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ تحریک ادب اور دبستان ہمالہ کا رشتہ بھی خالص ادب پر استوار ہے۔ فاروق مضطر صاحب کا یہ کرم ہے کہ انہوں نے تحریک ادب میں جب جموں وکشمیر کے اردو ادب کا وافر مواد ہر شمارے میں شایع ہوتے دیکھا تو نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ہماری گفتگو اور اس تعلق سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ بھی جاری ہوا۔ اسی ادبی تعلق سے مجھے جموں وکشمیر اور لداخ کے اردو ادب کو کتابی صورت میں اپنے مضامین کے ساتھ یکجہ کرنے کا پروجکٹ ملا جس میں جموں ریجن کے تین خطوں (۱) پیر پنچال (۲) چناب (۳) جموں کے ساتھ

ساتھ کشمیر کے دونوں خطوں (۱) ساوتھ کشمیر (۲) نارتھ کشمیر اور لداخ کے اردو ادب پر بھی کام کرنا شامل ہے۔ کشمیر کے اور لداخ کے اردو ادب پر مواد یکجا کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں میری ایک کتاب ''وادیٔ کشمیر کے چند اہم شعرا' جلد اول' جو کہ دبستان ہمالہ کی پیش کش تھی، اسی پروجکٹ کا حصہ ہے۔ اس کی دوسری کڑی میری یہ کتاب ''ادبیات پیر پنچال'' ہے۔ جیسے جیسے کام مکمل ہوتا جائے گا، اشاعت ہوتی رہے گی۔

دبستان ہمالہ کا جو کتب خانہ ہے، جس کے متعلق چند اہم باتیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اس وسیع وعریض لائبریری میں شعبہ ہائے زندگی کے تمام موضوعات مثلاً مذہب (دوسرے مذاہب کے متعلق بھی) سائنس، کامرس، آرٹ، ادب، سماج، ہندی، اردو، انگریزی اور دوسری جموں وکشمیر، لداخ کی مرکزی اور علاقائی زبانوں اور بولیوں میں وافر مواد موجود ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں کتابیں دستیاب ہیں اور ہر خاص وعام تشنگان علم کے لئے اس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں جموں وکشمیر اور لداخ کے دور دراز علاقوں اور صوبوں سے لوگ اپنی پی ایچ ڈی اور دوسری ریسرچ کے متعلق مواد کے حصول کے لئے دبستان ہمالہ سے رابطہ کرتے ہیں، یہاں آتے ہیں اور علمی فیض حاصل کرتے ہیں۔ دبستان ہمالہ کا کتب خانہ ڈیجیٹلائز ڈ ہو رہا ہے اور جلد ہی اپنی ویب سائٹ کے ذریعے پوری دنیا سے جڑ کر ہر شعبۂ حیات کے ہر علم کے خواہشمندوں کے لئے منبع فیض ثابت ہوگا۔

دبستان ہمالہ کا ہی ایک شعبہ ''ہمالین ہارمونی اینڈ پیس'' کے نام سے ہے جو ہر قیمت پر امن وآشتی اور کسی بھی قسم کے جبر وتشدد کے خلاف مہم میں پیش پیش رہتا ہے اور اخلاصی سطح پر ان سے نبرد آزما ہو کر ان کے سدباب کی کاوشیں کرتا رہتا ہے۔

جموں وکشمیر کے اردو ادب کے حوالے سے میری پہلی کتاب ''وادیٔ کشمیر کے چند اہم شعرا (جلد اول)'' دبستان ہمالہ کے زیر اہتمام شایع ہوئی تھی۔ میری یہ کتاب ''ادبیات پیر پنچال'' کی اشاعت کا سحرا بھی دبستان ہمالہ کے ہی سر ہے۔ دراصل یہ میرے اس پروجکٹ کا حصہ ہے جو دبستان ہمالہ کی جانب سے محمد فاروق مضطر صاحب نے مجھے عطا کیا ہے۔ راجوری سے تقریباً ۱۴۰۰ کیلومیٹر دور رہنے والے مجھ حقیر، فقیر کو جموں وکشمیر کے ادب کے متعلق اس بڑے

پروجکٹ کو عطا کرنا حقیقت میں میرے لئے فخر کا باعث ہے۔ مجھے اس ذمہ داری کا ہر پل احساس رہتا ہے کہ جو اعتماد ان کا مجھ پر ہے، اللہ اس اعتماد کو بنائے رکھے۔ آمین، ثمہ آمین!

نام: احمد شناس

جائے پیدائش: شاہدرہ شریف، راجوری

پیشہ: رٹائرڈ ڈپٹی کمشنر

تصنیف: پس آشکار (شعری مجموعہ)

صلصال (شعری مجموعہ)

انعام: لکھنؤ اردو اکیڈمی انعام

برائے شاعری

پتہ: 26.E,Tawi Vihar

colony lane no.5

Sidhra,Jammu.180019

موبائل نمبر:

نمونہ کلام

غزل

اس ہوا پانی کا ہر چشمہ دعا ہے
ہر نفس جینے کی خاطر مر رہا ہے

خون کی گردش میں شامل آب حیواں
میری شریانوں میں جنت کی ہوا ہے

اپنے اندر ہی نکل آیا ہے سورج
جسم اپنی دھوپ سے جاگا ہوا ہے

نیند میں کھلتا ہے جو بچے کے رخ پر
وہ تبسم رازداروں کی ادا ہے

تاک میں رہتی ہیں یخ بستہ ہوائیں
یہ شرر کب آسماں تک پہنچتا ہے

ساحلوں کے پھول مرجھائے ہوئے ہیں
منجمد جیسے سمندر کی ہوا ہے

کھو گیا وہ اشتہاروں کے سفر میں
روز اخباروں میں خود کو ڈھونڈتا ہے

رات کا غم ہے کہ میری ڈھڑکنوں میں
کوئی انجانا سویرا جل رہا ہے

خود گواہی کو یہاں مصلوب دیکھا
یہ خداؤں کی عمارت بے خدا ہے

شہر یہ اللہ والوں کا ہے احمد
ہر طرف انکار [illegible] لکھا ہوا ہے

احمد شناس

احمد شناس کی غزلیہ شاعری پر غور کیا جائے تو اپنی روایت کی بازیافت ان کے وظیفہ فکر و عمل کا اہم عنصر معلوم ہوتی ہے۔ جدید دور کے تعلق سے ان کی نظری اور عملی کارگزاری جو تخلیق کی صورت میں سامنے آئی ہے، وہ نئے تصورات اور دریافتوں کی روشنی میں ان کے نظریات کو فہم و فراست کی اس منزل پر فائز کر دیتی ہے جہاں زندگی کے تجربات کے بیانات تلخ اور پیچیدہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ پیچیدگی ان کے نظریات کے ارتقا، ان کے تخیل کی مزید فکری اور علمی گہرائی پر دال ہے۔ نہ کہ انھوں نے اپنے تجربات کو عرض شوق اور نئے نئے افکار کے نام پر مصنوعی تخلیق کی نذر کیا ہے۔ چند اشعار:۔

میں ریت کی وادیوں کا پالا ہوا ہوں یارو
کہاں سے لاؤں کمال ، آب حیات جیسا

کتابیں اپنے سینوں سے لگا رکھی ہیں لوگوں نے
مگر لفظوں کو ہم نے شہر میں جلتا ہوا دیکھا

ابھی کچھ حسن باقی ہے ، ہماری آنکھ میں احمد
کہ پتھر اس نے پھینکا اور ہم نے آئینہ دیکھا

تجارت دل کی دھڑکن گن رہی ہے
تعلق لطفِ منظر تک نہ پہنچا

بہت چھوٹا سفر تھا زندگی کا
میں اپنے گھر کے اندر تک نہ پہنچا

احمد شناس نے اپنے اشعار میں حقیقتوں کے جو بیانات پیش کیے ہیں وہ کلاسکی ادب کے مطالعے اور قدیم و جدید نظریات ادب کی مزید شناسائی کے بعد کی تفہیم و استقلال اور فہم و فراست کے آئینہ دار ہیں۔ احمد شناس نے جدید تہذیب کے ان عناصر کو اپنی تخلیقات کا محور و مرکز نہیں بنایا ہے جو متروکیت (OBSOLESCENCE) کو راہ دیتے ہیں بلکہ تہذیب کے ان عناصر پر توجہ کی ہے جو بڑی غور وفکر اور علمی مشاہدوں کے بعد وجود میں آئے اور جدید تہذیب کا حصہ بنے ہیں۔ بشر دوستی (HUMANISM) اور روشن فکری (ENLIGHTENMENT) کو بھی احمد شناس نے اپنے اشعار میں جگہ دی ہے لیکن ان کو پیش کرنے کا طریقہ اور اصول وہ نہیں ہے جو انھیں تاریخی قوتوں کے تابع کر دیتا ہے۔ بلکہ یہاں مختلف الخیالی کے وہ محور موجود ہیں جن کا ایک مرکز انسان کی ذات بھی ہے، نہ کہ انسان کی ذات کے اخراج کو لازمیت کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔

یہ کیسا پیاس کا موسم ہے احمد
سمندر دیدۂ تر تک نہ پہنچا

غرق کرتا ہے نہ دیتا ہے کنارہ ہی مجھے
اس نے میری ذات میں کیسا سمندر رکھ دیا

ہم بھی ہو گئے شامل مصنوعی تجارت میں
ہم کہ چہرہ ساماں تھے اب کہ آئینہ مانگیں

اگ آئیں گی سر سے پاؤں تک ان گنت زبانیں
ہر اک زباں کا بیان تیرے خلاف ہوگا

سراب رشتوں کا گھیر لے گا شناس مجھ کو
ہر ایک رخ پہ ہزار چہرہ غلاف ہوگا

احمد شناس نے اپنے متعین کردہ چند مخصوص نظریات کو تخلیقی سطح پر اس آزاد فضا کے ساتھ برتا ہے، جسے ان کے نظام افکار کی کلید کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے متعینہ نظریات سے باضابطہ وابستگی کے ساتھ ساتھ شعری تجربات کے سلسلے کو بھی قائم رکھا اور اس کے سماجی مقاصد کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اس عمل کو ان کی افتاد طبع بھی کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے شعری طریقۂ کار میں سماجی مسائل کی اہمیت کے اثبات کے ساتھ ذاتی تناظر کی کارفرمائی کو بھی پیش پیش رکھا ہے جو ایک معینہ زاویۂ نظر کی موجودگی کے باوجود شعری رمز و اسرار کے رنگ و آہنگ کو نئے امکان کی جانب موڑ دیتی ہے۔

لفظوں کی پوشاک میں تھے انداز بہت
ورنہ عریاں تھی میری آواز بہت

وہ بانٹتا رہا لفظوں کا ذائقہ احمد
ہمیں عزیز رہے کاغذوں کے پھول بہت

نفس کے سانپ نے مآخذ تمام چاٹ لئے
میں زندگی کا تصور کہاں سے لاؤں گا ماں

ہم خود کو پہچان نہ پائے اکثر
چہروں پہ لمحوں کی دھول رہی ہے

بستیوں میں جابجا دیکھی ہے فصل تشنگی
پھول شاید ہوں وہاں میرا جہاں سایہ نہ تھا

احمد شناش نے اپنی طرز فکر کو اجتماعی فن کے محرک کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے جس سے ان کے فن کی صورت گری میں تخلیقی قوتوں کے بجائے طے شدہ فارمولوں پر تکیہ ہو اور ان کی انفرادی استعداد اجتماعی تقاضوں کے زیر سایہ سطح شعور کے پست ہونے کی عکاسی کرے بلکہ ان

کے یہاں اعلیٰ صلاحیتوں کی ترجمانی کا خواب اور اس کی تعبیر کی مختلف شکلیں ملتی ہیں جو انفرادی لے کو برقرار رکھتی ہیں اور تخلیقی رشتے ذات سے منقطع ہو کر غیر ذات سے استوار نہیں ہو پاتے۔

احمد شناس نے اپنے اشعار میں تجربوں کو اس نوعیت سے برتا ہے کہ وہ انسانی نظام افکار و احساس کی مختلف سطحوں پر اپنے اثرات منعکس کرتے ہیں۔ اس طرح وہ فلسفیانہ تخلیقی فکر کے لئے بھی موضوع و مواد کی فراہمی کے تعلق سے تاریخی وقائع اور حالات کے حصوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔

زمانہ لوٹ کر ڈھونڈے گا خود کو ان خرابوں میں
امانت کی طرح محفوظ رکھنا یاد لمحوں کی

باقی ہر رشتہ ہماری زندگی کا ہے اٹوٹ
ایک انساں کا تعلق ہے کہ بس کمزور ہے

لفظ جب اترا مری آنکھیں منور ہو گئیں
لفظ احمد زندگی سے رابطے کی ڈور ہے

تیری اذاں کے ساتھ میں اٹھتا ہوں پو پھٹے
سر میں لیے ہوئے کوئی سجدہ اسیر کا

صحرا کے جسم، روح کے اندر اتر گیا
اب کیا دکھائے معجزہ انساں ضمیر کا

احمد شناس نے فن کی کلی حیثیت اور موضوع و اسلوب کی وحدت اور ان کے ناگزیر ربط کو واضح شعوری سطح کے ساتھ اپنے اشعار میں برتا ہے۔ اس طرح موضوع اور ادائے بیان کے ربط اور فطری تعلق کے ادراک کے باعث ان کے یہاں وہ تذبذب اور کشمکش بھی ملتی ہے جو ان کے تخلیق جواز کو تحفظات کی راہیں ہموار کرتی ہے۔

احمد شناس اپنے فن میں موضوع اور طرز بیان کے ناگزیر ربط کو برتنے میں کسی ایک

رخے پن کے شکار نہیں ہوتے ہیں۔ اسلوب تحریر کا اعتدال شعری اہمیت کے تعلق سے ادبی تخلیق اور جمالیاتی عمل خالص بیانیہ اور خارجی عمل کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ باطنی واردات کی منظر کشی میں بھی تاثیر کا عنصر بہت ہے۔ ان کے یہاں خارجی تفصیلات کم کم ہیں اور داخلی احساسات پر زیادہ زور ملتا ہے۔

طلوع صبح کو صدیاں گزر گئیں احمد
ہے انتظار کی عادت عجب زمینوں میں

دیکھتے ہی دیکھتے لفظوں کی خوشبو اڑ گئی
اک تماشہ تھا، وہ تحریروں کا وعدہ سچ نہ تھا

اپنی عریانی چھپانے کا حسین اسلوب تھا
میں نے جو اوڑھا تھا لفظوں کا لبادہ، سچ نہ تھا

آنکھ میں نہیں احمد ایک بوند آنسو کی
رحم کی دعاؤں کا ہر خطاب گم گشتہ

پھر دیار جسم میں لہرائے گا پرچم نیا
قافلہ سالار گرد کارواں ہو جائے گا

احمد شناس کے یہاں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ وقت جو ایک زمانی حقیقت کو دوسرے زمانے میں منتقل کرتا ہے اور عہد بہ عہد حالات کی کڑی سے کڑی ملاتے رکھتا ہے، احمد شناس کے فن میں انسانی تجربوں کے ایک سلسلے وار عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جہاں وقت نے ماضی کی صورت اختیار کی ہے وہاں اپنے عہد کے فکری اور تخلیقی شعبوں میں نئی نئی جستجوؤں کے عناصر ماضی کو نئے معنی سے ہم کنار کرتے ہیں۔ اس طرح ماضی، حال کی معنویت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

احمد شناس اپنے اشعار کے اندر برتے گئے تاریخ کے مادی تصورات کو اس کے طبیعی مظہر کے حوالے سے اپنے شعری تجربوں کے طور پر ایک ناگزیر حقیقت تسلیم کرتے ہیں ۔ وہ تہذیبی ارتقا کے خواہاں ہیں ۔اس لئے ان کے جذباتی نظام کی ہیتیں تبدیل بھی ہوتی ہیں اور بعض اوقات نئے نظام اقدار کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔لیکن اس سے زندگی کے فطری اور مسلسل عمل جو تخلیق کار کی نظر میں انسان کے بنیادی نظام جذبات سے علاقہ رکھتے ہیں ان پر کوئی ضرب نہیں آتا۔

لفظوں کی دسترس میں مکمل نہیں ہوں میں
لکھی ہوئی کتاب کے باہر بھی سن مجھے

ہمیں جغرافیہ پڑھنا تھا احمد
مگر تاریخ کا غم لگ گیا ہے

ساتھ ہولیتا ہے ہر شام وہی سناٹا
گھر کو جانے کی نئی راہ نکالی جائے

ہم سے کیسے جذبوں کی رشتگی بنی کیا کیا
موجۂ ہوا جیسے آنے جانے والوں سے

اب تو ملتے ہیں سمندر بھی سرابوں جیسے
اب وہ انسان کہاں زندہ کتابوں جیسے

احمد شناس کی ادبی زندگی نے سماجی شعور اور سیاسی مسائل کو ذاتی تجربے سے وابستہ کر کے تخلیقی روا ختیار کی ہے۔نوعی اعتبار سے دیکھا جائے تو انھوں نے اپنی تخلیقات میں تجربات کی کئی انتہاؤں کو سماجی بحران اور ذاتی بحران کے آپسی ربط کے طور پر برتا ہے۔عہد حاضر ہماری شعری روایت کے اس دور سے وابستہ ہے جہاں شک وشبہات کی ایک توانا لہر ہے اور اس کا دائرہ مسلسل پھیلتا ہی جارہا ہے۔اس لہر نے احمد شناس کے تخلیقی تجربات کو بیرونی یعنی دنیاوی مسائل اور انتشار کے بیان کا وسیلہ بنانے کے ساتھ ساتھ نئے ذہنی ،تہذیبی اور جذباتی ماحول کے بیانات

کا وسیلہ بھی بنایا ہے۔ یہ بیانات جہاں فی الواقع نئی تعلیم کے اثرات کو نمایاں کرتے ہیں، وہیں ان کا مدعا انفرادی لے کی جستجو اور سماجی مقاصد کے جم غفیر میں اپنی تخلیقی استعداد کی پہچان اور اس کا اظہار بھی ہے۔

پھر کوئی مانگے دعا غیر کی خاطر احمد
پھر وہ موسم کھلیں بستی میں گلابوں جیسے
یہ ضرورت کا سفر جانے کہاں لے جائے گا
چیز اونچی ہوگئی انسان کمتر ہوگیا

قلم دفتر میں جب سے کاروباری ہوگیا ہے
کلاشنکوف کا دستور جاری ہوگیا ہے
تماشہ دیکھنا لوگوں کی عادت بن گئی ہے
ہمارے عہد کا ہیرو مداری ہوگیا ہے
اصولوں سے ہے ذاتی سا تعلق آدمی کا
جو پرچہ لازمی تھا اختیاری ہوگیا ہے
ہمارے گھر کا جگنو پھونک ڈالے گا مکاں کو
کہ اب یہ حادثہ قسمت ہماری ہوگیا ہے

احمد شناس نے اپنی شاعری میں علوم جدیدہ سے پیدا شدہ مثبت اور منفی جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کو اس طرح تخلیقی جامہ پہنایا ہے کہ جو حضرات نئی غزل میں پرانی غزل کا رنگ وآہنگ تلاش کرتے ہیں اور ان کی خصوصیات کو صرف تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ قبول کر سکتے ہیں۔ وہ بھی احمد شناس کی غزلوں سے مایوس نہیں ہوتے۔ اس طرح ان کی شاعری کو لفظ ''ادب'' کے تناظر میں جب ہم دیکھتے ہیں تو وہ اس لفظ کے تمام تقاضون کا پاس رکھتی ہے اور ادب میں احمد شناس کے مقام ومرتبے کا تعین کرتی ہے۔

نام: انور خان

قلمی نام: انور خان

والد: محمد اسماعیل خان

پیدائش: ۲۵، اپریل ۱۹۷۱ء

تعلیم: ایم۔اے (اردو)

پیشہ؛ لکچرار اردو

ذریعہ اظہار: اردو

پتہ: House no. 23 Ward no.5
Mohalla Dungas poonch city

موبائل:9858113620

یاد

تمھیں تو یاد نہیں، مجھ کو یاد ہے لیکن
گلاب رستو پہ چلنے کی چاہ تھی کس کو
کسے طلب تھی ہواؤں کا رخ بدلنے کی
بدن حصار میں خوشبو کا رنگ بھرنے کی
سیاہ رات کے دامن کو نور کرنے کی
یہ پھول جسم کا، کس کی چبھن سے مہکا تھا
کسے یقین تھا، ٹوٹیں گی ساری دیواریں

تمھیں تو یاد نہیں، مجھ کو یاد ہے لیکن
مجھے تو یاد ہے یہ بھی کہ پھر ہوا کیا تھا

گلاب رستو پہ کانٹے بچھائے تھے کس نے
کہ کس نے بدلا تھا رخ سنگ سنگ موسم کا
بدن حصار سے خوشبو چرائی تھی کس نے
کہ کس نے مانگا اجالا تھا، دے کے تاریکی
بدن گلاب کی خوشبو کو کس نے بیچا تھا
بنائی بیچ تھی دیوار ایک چاندی کی
یہ مجھ کو یاد ہے لیکن تمھیں ہی یاد نہیں

انور خان

انور خان نے صنف نظم اور غزل دونوں پر طبع آزمائی کی ہے اور دونوں کو بڑی کامیابی سے برتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مادے کی پر اسراریت پر زیادہ توجہ کی ہے جو کہ شاعر کو حسی اضطراب سے دو چار کرتا ہے۔ اپنی رومانی کیفیت کے بیان میں انہوں نے ان سوالات کا بھی دھیان رکھا ہے جو غیر ارضی یا ماورائی حقیقتوں کا احساس دلاتے ہیں۔ دور حاضر کے معاشرے میں انسان کے حیاتیاتی ارتقا اور اس تعلق سے بہت کچھ غیر اہم اپنا لینے اور بہت اہم کو اپنے وقتی مفاد کے لئے نظر انداز کر دینے کے رجحان کی آئینہ داری انور خان کے یہاں بہت موثر پیرائے میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی احساس انہیں بعید از قیاس قوت کا شعور عطا کرتا ہے اور وہ اس سے حالات بدلنے کی دعا ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اتری شام تو برسا پانی یا اللہ
ہم جیسوں کی یہی کہانی یا اللہ
سورج کی دہلیز پہ آکر ٹھہر گئے
اندھیروں نے کیا ہے ٹھانی یا اللہ

اس قسم کے اشعار میں مذہبی تصور کی حمایت کا جذباتی وفور نہیں ہے بلکہ ایک مستحکم زاویۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے، جس کی توجیہہ کا مواد خود ان کے اپنے عہد کی فکر کا عطا کردہ ہے۔ یہ جمالیاتی بصیرت نئے علوم سے بہرہ ور ہو کر جہاں انور خان کی شاعرانہ روشن نظری کا پتہ دیتی ہے ، وہیں ان کی شاعری کی منفرد قدر و قیمت کی غماز بھی ہے۔

نام:	شام سندر آنند لہر
والد کا نام:	شری بلراج آنند
تاریخ پیدائش:	۲ر جولائی 1951ء
مقام پیدائش:	پونچھ (جموں وکشمیر)
تعلیم:	بی۔ ایس سی، بی۔ اے (اردو)، ایل۔ ایل۔ بی
مشغلہ:	وکالت
تصانیف:	نروان (مختصر ڈرامے)، تپسوی کون (طویل دراما)، سرحد کے اس پار (افسانوی مجموعہ)، اگلی عید سے پہلے (ناول)، سرحدوں کے بیچ (ناول)، مجھ سے کہا ہوتا (ناول)، انحراف (افسانوی مجموعہ)، کورٹ مارشل (افسانوی مجموعہ)، سرحد (ریڈیائی ڈرامے)، یہی سچ ہے (ناول)، بٹوارہ (افسانوی مجموعہ) سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے (افسانوی مجموعہ) نامدیو (ناول)
انعامات واعزازات:	سال ۱۹۹۷ء کا راجستھان اردو اکیڈمی انعام/اتر پردیش اردو اکیڈمی انعام ۱۹۹۷ء

امریکن بایوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ کا مین آف دی ایئر ایوارڈ ۱۹۹۷

میرا کیڈمی، لکھنؤ انعام/ پراچین کلا کیندر چنڈی گڑھ انعام ۱۹۹۷

اتر پردیش اردو اکیڈمی ایورڈ (سرحد کے اس پار) ۲۰۰۳ء

جموں وکشمیر اردو فورم انعام ۱۹۹۷ء/ادیان اکیڈمی، اڑیسہ اعزاز ۲۰۰۱ء

لالہ جگت نارائن جالندھر انعام ۲۰۰۵ء/نمی ڈوگری سنستھا انعام ۲۰۰۱ء

صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ڈراما ''بٹوارہ'' پر ۵۰۰۰۰/کا انعام ۲۰۰۸ء

جموں وکشمیر رائیٹرز فورم اعزاز ۲۰۱۰ء

اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ (سرحدیں) ۲۰۰۶ء

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ اردو ڈیپارٹمنٹ اعزاز

جموں یونیورسٹی پروفیشنل اردو کورس اعزاز ۲۰۰۰ء

حیات اللہ انصاری ایوارڈ، ہندوستانی ادبی کلچر بنارس ۲۰۱۳ء

'ساہتیہ رتن ایوارڈ' سنچیتنا، دیوبند، یوپی

'مہاراجہ پرتاپ سنگھ ایوارڈ' تحریک بقائے اردو

ماہنامہ 'شاعر' ممبئی اور سہ ماہی 'رنگ' دھنباد نے اور 'عصری آگہی' دلی 'تحریک ادب' بنارس نے گوشے شائع کیے

'آب جو' کشتواڑ کا 'آنند لہر نمبر'

'اسباق' پونا 'شاندار' اعظم گڑھ نے گوشے مرتب کیے

گورونانک دیویونیورسٹی امرتسر میں پی ایچ۔ڈی کی گئی۔ موضوع: 'آنند لہر فن اور شخصیت'

جموں یونیورسٹی میں افسانوی مجموعہ انحراف، بٹوارہ، مجھ سے کہا ہوتا ناولوں پر ایم۔فل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ میں افسانوی مجموعے ''سرحد کے اس پار'' پرایم۔فل کی گئی

گورونانک دیویونیورسٹی پنجاب (امرتسر) کے ایک طالب علم نے آنند لہر فن اور حیات پر پی ایچ۔ڈی کی

'اکیسویں صدی میں اردو ناول' کے سیمینار میں ناول 'یہی سچ ہے' پر خصوصی مقالہ پڑھا گیا اور اسی نشست میں اس پر سیر حاصل بحث بھی کی گئی۔ گیان پیٹھ کی طرف سے 'آج کی اردو کہانیاں' کا ہندی ترجمہ شائع کیا گیا جس میں کہانی 'دادی ماں' سرفہرست ہے۔ جناب گوپی چند نارنگ نے جو کتاب آج کی کہانیاں مرتب کی ہے اس میں کہانی 'بٹوارہ' بھی شامل ہے۔

دہلی یونیورسٹی وحیدر آباد یونیورسٹی میں ایک ایک طالب علم ایم۔فل کر رہے ہیں

حیدر آباد یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی میں ناول ''اگلی عید سے پہلے'' پر ایم۔فل کی جارہی ہے۔

افسانہ 'بٹوارہ' پر دوردرشن کے کشیر چینل سے پانچ ایپیسوڈ کا سیریل ''تقسیم'' کے عنوان سے بنایا گیا اور نشر کیا گیا اور 'اگلی عید سے پہلے' پر پانچ ایپیسوڈ کا سیریل بنایا گیا اور دوردرشن کے کشیر چینل سے نشر کیا گیا۔ دوردرشن کیندر جموں وسرینگر سے افسانوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا اور آکاش وانی سے افسانہ 'برف اب بھی سفید ہے' پر ڈراما نشر کیا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے اردو چینل و دیگر چینلوں پر کہانیاں و مضمون نشر کیے گئے اور کیے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ای۔ ٹی۔ وی و دوردرشن نیشنل پر بھی آنند لہر کی ذات وشخصیت پر خصوصی پروگرام نشر کیے گئے اور کیے جارہے ہیں۔

آنند لہر جموں کشمیر انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر و جموں وکشمیر یونیورسٹی کی طرف سے اردو کے فروغ کے لیے بنائی گئی کمیٹی کے ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ بیشتر ادبی تنظیموں کے سرپرست بھی ہیں۔

آنند لہر کی کہانیوں اور ناولوں کا ترجمہ ہندی، پنجابی اور ڈوگری میں بھی ہوا ہے

رابطہ: S.s.Anand Laher,1.9.Bakhshi Nagar,Jammu.
pin code.180001(Jammu And Kashmir)

فون: 0191/2582651/2581871

موبائل: 9419797660

آنند لہر

''یہی سچ ہے،، آنند لہر کا تازہ ناول ہے۔اس میں انھوں نے عہد حاضر کے بدلتے ہوئے حالات کی جدت پسندی، رنگارنگی اور توسیع کو کرداروں کے ذریعہ بالکل مختلف یا یوں کہیں کہ تضاد رویوں اور نوعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔انھوں نے ناول کے کرداروں کو جو نام دئے ہیں ،ان کی صفات کو بھی یا ان ناموں کی صفات کے کسی نہ کسی گوشے کو عین مطابق اور ایک ہی صفت کے دوناموں کو بھلائی + برائی سے بے اطمینانی اور دوسرے کو برائی + بھلائی قلبی سکون جیسے ان سلجھے پہلوؤں کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کے لئے انھوں نے مکالمہ نگاری سے جو کام لیا ہے، وہ انکشاف کرتا ہے کہ اس قسم کی مکالمہ نگاری کے لئے کتنے وسیع علم، مشاہدے اور تخلیقی فن کی ضرورت ہوتی۔ان کے ایک کردار کا نام ''کوشل'' ہے جس کے ایک معنی سوجھ بوجھ والا بھی ہوتا ہے۔اس کا ایک معنی ہنرمندی بھی ہوتا ہے جیسے رن کوشل بہ معنی میدان جنگ میں ہنرمندی سے کام لینا۔ناول میں کوشل نامی کردار کی صفت سوجھ بوجھ کی ہنرمندی سے کام لینے والے کی ہے لیکن اس کی ذات میں تکبر کے عناصر شدت کے ساتھ موجود ہیں اور نمایاں ہوتے ہیں۔اور جیسا کہ ہندی میں کیا گیا ہے کہ ہر چیز کی اتی بری ہوتی ہے اور یہ بھی کہ ''وناش کالے وپریت بدھی یعنی جب براوقت آتا ہے تو عقل بھی اسی طرح کام کرنے لگتی ہے۔

اور کوئی ضروری نہیں کہ براوقت شروع ہونے کے فوراً بعد ہی اپنا اثر دکھانے لگے بلکہ یوں بھی ہوتا ہے کہ فرد عادات واطوار سے اپنی شخصیت کی ایسی تخلیق کرتا ہے کہ تخلیق کی ابتدا سے ہی اس کا براوقت تو شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کی شخصیت کی شکست میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔لیکن پھر یہ شخصیت کا بکھراؤ زندگی بھر کے لئے غیر مختتم لمحات کی صورت اختیار کر لیتا ہے ''کوشل'' کا بھی یہی معاملہ ہے۔چند جملے ملاحظہ ہوں:

> 'کوشل ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ایک دن ساوتری کو ایک شادی میں ملا۔اس نے ساوتری پسند کرلی۔مگر وہ ہر بات ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس کے دل کے اندر ایک عجیب قسم کا غرور رہتا تھا۔مگر ادھر اپنی

خواہش سے بھی مجبور تھا۔

مجھے لڑکیاں دیکھنے کی فرصت ہی نہیں اور پھر میں تو ہمیشہ پڑھائی میں مشغول رہنا چاہتا ہوں۔ اگر اس عمر میں لڑکیوں کو ہنستے دیکھوں تو میں کبھی بھی بہت بڑی پوزیشن حاصل نہیں کر سکتا۔

کوشل

ہاں پاپا بولو اس نے جواب دیا۔

تم شادی کیوں نہیں کرتے؟

کرلوں گا پاپا۔

کوئی لڑکی دیکھی ہے؟

کسی سے بھی کرلوں گا۔ دنیا میں سب لڑکیاں ایک جیسی ہی تو ہیں۔

میں شادی کو تیار ہوں۔

کس لڑکی سے؟ باپ نے پوچھا۔

اتنی دیر میں کوشل نے دیکھا کہ ساوتری بازار سے سبزی لے کر سامنے سے گزر رہی ہے۔

پاپا اسی سے شادی کرادو۔

بس اسی طرح ساوتری سے اس کی شادی ہوگی اور اس نے جہیز بھی نہیں لیا

؎

اس طرح ایک کردار شنکر مذہبی اعتبار سے خصوصی اور عموصی نوعیت کی تمام حد بندیوں میں اپنے آپ کو مقید رکھتا ہے۔ اس راستے میں جو بھی پریشانیاں اس پر اور اس کے بیوی بچوں پر آتی ہیں، برداشت کرتا ہے اور گھر والوں کو برداشت کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ پوری زندگی وہ اپنے خالق کے عائد کردہ حکموں پر اپنی ذہنی پیچیدہ الجھنوں کے ساتھ استقامت کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ ''شنکر بھگوان'' کے ستیہ میو جیتے اور مکمل ایماندارانہ صفت سے متصف ہے۔ ان تمام کے بدلے حد درجہ انعامات کی خواہش اسے اپنی بیوی بچوں کے دکھ درد سے بیزار کر دیتی ہے۔ حالانکہ اسے کبھی قلبی سکون میسر نہیں آتا جو کہ ان تمام کے صلہ میں ضرور آجانا چاہیے

تھا۔یہیں بھلائی + برائی = بے اطمینانی کا عقدہ بھی جنم لیتا ہے۔ بھلائی اپنے لئے اور اس عمل کے نتیجہ میں گھر والوں کو ایذا پہنچنا گویا گھر والوں کے ساتھ برا سلوک اور نتیجہ روحانی بے اطمینانی اور اس بے اطمینانی کا آخری دنوں میں موہ مایا کا تیاگ کر کے جنگل میں ایشور کی آرادھنا کے لئے چلے جانے کے بعد بھی قائم رہنا، سماج کی نئی صورت حال کی پر اسرار فضا کی حیران کن عکاسی پیش کرتا ہے۔ مکالمہ نگاری جو کہ ضمنی کرداروں مثلاً ''شنکر'' کے بیوی، بچوں کے ذریعہ ادا ہوئی ہے، کے توسط سے ناول کی کامیابی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چند جملے اور اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''اچھا ٹھہرو میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں'' نرملا نے کہا

''نہیں مجھے پہلے ڈاکٹر کو پیسے دے آنے دو''

''کیوں جلدی کیا ہے''؟

جو کام ہو جائے وہ ٹھیک ہے۔ کیا معلوم روپئے دیکھ کر تمہارے دل میں بھی کوٹ لینے کی خواہش جاگ پڑے جو مجھے بے ایمان بنا دے اور میں ڈاکٹر کے پیسے مارنے کے بارے میں سوچنے لگوں۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے'' نرملا نے کہا

''کیوں نہیں''

''آپ ایسے نہیں ہیں'' نرملا نے کہا

میں ایسا نہیں ہوں مگر روپئے کا لالچ انسان کو ایسا بنا دیتا ہے۔

''پتا جی، چاچا اپنے بیٹوں سے کتنا پیار کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ رشوت لیتا ہے۔ اسے نرک ملے گا۔ پھر بھی اپنے بیوی اور بچوں کے لئے رشوت لیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھگوان چاہے اس سے نفرت کریں مگر اس کے بچے تو اس سے پیار کرتے ہیں۔

شنکر یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ سریش کی بات کو ٹالتے ہوئے اس نے کہا! مندر جایا کرو اور اچھی باتیں سوچا کر۔ گھور کل جگ، چھوٹے بڑوں کو نصیحت کرتے ہیں۔'' شنکر گرجا۔ پتا جی چاچا نرک میں جائے گا لیکن اس کے بیٹے تو سورگ میں جائیں گے۔ انھیں تو نرک میں نہیں جانا پڑے

گا کیونکہ انھیں اچھی تعلیم ملے گی۔ ان کے پاس زمین ہوگی۔ مکان ہوگا۔ روپئے ہوں گے۔ انھیں رشوت لینے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ وہ بے ایمانی نہیں کریں گے۔ انھیں سورگ ملے گا۔ مگر ہمارے پورے خاندان کو نرک ملے گا۔''

''سریش مرگیا۔ شنکر کے اوپر اور قرض چڑھ گیا لیکن سریش کی موت کا شنکر کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ وہ دن رات پریشان رہنے لگا۔''

''شنکر بھگوان کی تلاش میں تپسیا کرنے کے لئے جنگل میں چلا گیا ہے اور بے حد دکھی ہے۔''

دوسرا کردار شنکر کا بھائی شیو ہے جو رشوت لیکر ہونے والے کام کو بھی پوری ایمانداری سے انجام دیتا ہے۔ اپنی بیوی بچوں کو خوش رکھنے اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لئے وہ کوئی کور کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ اسے اپنے نرک میں جانے کے یقین کے باوجود قلبی سکون حاصل ہے۔

یہاں برائی + اچھائی = قلبی سکون کا عقدہ جنم لیتا ہے اور ''شیو'' نام کے برخلاف ایک متضاد عمل بھی سامنے آتا ہے۔ یہ رویہ عہد حاضر میں جس طرح پڑھے لکھے اور سنجیدہ طبقے کے ساتھ ساتھ عام پڑھے لکھے طبقوں میں بھی رواج پا رہا ہے اور موجودہ حالات کے تحت معاشی پیچیدہ مسائل کے حل کی اس قسم کی کوششیں انسانی اقدار کو کہاں لے جا رہی ہیں، یہ الگ مسئلہ ہے۔ اہم نقطہ یہ ہے کہ راوی یا مصنف نے اس کردار کے حوالے سے افسانے میں شامل ہوئے بغیر نئے دور کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے، وہ اقدار کی تبدیلی کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ یعنی روایت کا مثبت عمل اور طریقۂ کار دور حاضر میں ایک طرح سے منفی پہلو بھی رکھتا ہے۔ اور منفی عمل اور طریقۂ کار زمانے کے رگ و پے میں بری طرح پیوست ہونے کے سبب مثبت پہلو بھی رکھتا ہے۔ یعنی اگر زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے تو ان کو اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔ یہ اور اس طرح کی بہت ساری دنیاوی اور مابعد دنیاوی پیچیدگیوں اور اسرار و رموز کو سمیٹے ہوئے یہ کردار تجسسی فضا کاری کے حوالے سے ناول کی کامیابی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں بھی چند جملے اور اقتباسات درج ذیل ہیں۔

''جناب میرا کام ہوگیا؟''

''بالکل ہو گیا ہے''

''لیجئے صاحب اپنا حصہ''

''باقیوں کو دے چکے ہو؟''

''ہریا، ہریا

تمھیں''ملِ گیا؟''

صاحب بالکل۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''شیو بھگوان کی پوجا بھی ایمانداری سے کرتا ہے۔ اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگتا بلکہ دعا کرتا ہے کہ ائے بھگوان میرے بیٹوں کو اس قابل بنا کہ اس دنیا میں جینے کے لئے انھیں ایسے گناہ نہ کرنے پڑیں جو وہ کر رہا ہے۔ وہ پوجا اس لئے کرتا ہے کہ بھگوان نے اسے پیدا کیا ہے۔ شیو یہ سمجھتا ہے کہ اگر مر کر اسے نرک بھی ملے گا تو پھر کیا ہے وہ اپنے بیٹوں کو تو سورگ دے جائے گا۔ دھرتی کا سورگ۔''

''آج شیو جب دفتر سے گھر آ رہا تھا تو اچانک ایک کار سے ٹکرا گیا اور اس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کی۔۔۔۔۔۔ٹانگ ٹوٹ گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شیوا پاہج۔۔۔ ہو گیا

ڈاکٹروں نے اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی۔ لیکن شیو اس بات سے خوش ہے کہ اس کو پاپیوں کی سزا ملی ہے۔ یہ ہی وہ قیمت ہے جو اپنے بڑے لڑکے کو ڈاکٹر اور چھوٹے کو انجینئر بنانے کے بدلے قدرت اس سے لے رہی ہے۔ اس مطابق یہ اچھا ہوا کہ وہ مرا نہیں کیونکہ اس کی روح کو کبھی چین نہ ملتا۔''

''شیو کے لڑکے نے ایک بہت بڑا آپریشن کیا اور ہر شخص نے اس کی تعریف کی۔ لوگ بھول گئے کہ شیو رشوت لیتا تھا۔''

اسی طرح اس ناول میں آنند لہر نے اپنے دیگر کرداروں سے جو کام لیا ہے، وہ بھی ناول کے فنی عناصر کو غیر شعوری کاوش سے برتنے کے رویے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے

کہ ناول تصنع، میکانکیت اور محدودیت کا اسیر نہ ہو کر آفاقی جہتوں کی جانب پرواز کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آنند لہر نے اپنے کرداروں، منظر اور مکالمے کے توسط سے ناول کو کسی مقررہ فنی سانچے میں ڈھالنے سے گریز کیا ہے۔ ان کے ناول کا ہر کردار اپنے آپ میں مرکز کی حیثیت رکھتا ہے ۔شنکر اور شیو کی بہن ساوتری جس کی شادی کوشل سے ہو جاتی ہے، اس پر کوشل کی بیجا رعب داریوں اور اس وجہ سے گھر کے تباہ ہونے کا بیان مکالمہ نگاری کی بہت عمدہ مثال ہے۔

''آپ کے پاس آج بھی وقت نہ تھا۔''

''نہیں میں نے جج کی کرسی بڑی محنت سے حاصل کی ہے۔ یہ اور بات ہے تم سے شادی کر لی۔''

''یہی میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کی ایمانداری اور ججی کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہوں اور اپنا ایک الگ وجود بھی ختم ہو گیا ہے۔''

''کیا عورت کا الگ وجود ہونا چاہیے؟''

ہونا چاہیے یا نہیں۔ یہ فیصلہ کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں کیونکہ عورت کا الگ وجود صدیوں سے ہے اور قائم رہے گا۔ اور جو عورتیں عام آدمیوں کے ساتھ شادی شدہ ہیں، وہ شاید مجھ سے اچھی طرح جیتی ہیں۔''

''تو طلاق لے لو''

''اصل میں تم طلاق کے کاغذات پر دستخط نہ کرنے کا بوجھ بھی مجھ پر ڈالنا چاہتے ہو۔

''تم ایماندار ہو کہ نہیں یہ الگ بات ہے مگر اصل میں تم ہمیشہ دوسروں کو بے ایمان ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔ اپنے آپ کو اچھا ثابت کرنے کا تمھیں وہم ہے۔''

''وہم کیا ہے اور کیا نہیں میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں اور آج تمہیں طلاق دے کر ہی رہوں گا۔''

''تم کر بھی کیا سکتے ہو اس کے علاوہ، اور یاد رکھو میں ایک پڑھی لکھی عورت

ہوں۔ کہیں بھی نوکری کرلوں گی۔ لاؤ کہاں دستخط کرنے ہیں ۔''

آنندلہر نے ناول میں ایک اہتمام یہ کیا ہے کہ منشائے مصنف یا نظریۂ مصنف کو ناول کی تکنیک کے جز کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے۔ اس وجہ سے مصنف کے ساتھ ساتھ قارئین کو بھی کردار، واقعات اور دیگر اجزائے ناول پر ء نقد و تبصرہ کرنے کی پوری آزادی مل جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس طرح مصنف موقع محل کے اعتبار سے اپنے نظریاتی موقف کے اظہار و تبلیغ کے سلسلے میں ناول میں داخل ہوسکتا ہے۔ لیکن کامیاب ناول نگار وہ ہے جو کردار اور واقعات کی روشنی میں ناول کے انجام کو بھی واقعات کی شکل دے دے۔ یعنی ناول میں جو مرکزی واقعہ بیان کیا جا رہا ہے، اس کی روشنی میں نشاندہی کردے۔ آنندلہر نے اپنے ناول کا اختتام اس طرح کیا ہے کہ اہم کرداروں کی زندگی کے گزر رہے آخری دنوں کا خاکہ کھینچ دیا ہے اور بس۔ دلیل کے طور پر چند ایک کا بیان ذیل میں درج ہے۔

> ''رمیش (شنکر جو کہ نہایت ایماندار ہے، اس کا بیٹا) کو آج چوری کے مقدمے میں دو سال کی سزا ہوئی۔ لوگ بھول گئے کہ شنکر رشوت نہ لیتا تھا، اس لئے بیٹے کو چوری کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہ کہہ رہے تھے کہ ماں باپ کا اثر تو اولاد پر ہوتا ہی ہے۔ اور چیئرمین جس کے ساتھ نرملا سوئی تھی، اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ ہسپتال میں ہے۔
>
> شیوا اپنے پاپوں کا پراشچت کر رہا ہے اور حد سے زیادہ خوش ہے۔ دھرم پال بہت خوش ہے۔ وہ باپ اور پن کے بندھن سے آزاد ہے۔ ناگپال ایشور کے ڈر سے ڈرا ہوا ہے اور دکھی ہے۔ کوشل کو معلوم ہی نہیں کہ وہ سکھی ہے یا دکھی ۔ اور مندر سے گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ کہہ رہی ہے ''یہی سچ ہے۔''

آنندلہر نے ناول میں ڈرامے کی خصوصیات کو بھی بحال رکھا ہے۔ یعنی اس ناول کو بہت آسانی سے اسٹیج کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے منظر، واقعات اور مکالمے کا ایسا اہتمام کیا ہے کہ اگر اسے قسطوں میں اسٹیج کیا جائے تو یقیناً یہ ایک بہت کامیاب ڈرامہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اس

ناول میں آنند لہر نے ایسے مکالمے بھی تحریر کیے ہیں جو زندگی اور بعد الموت کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک کردار دھرم پال بہت خاص ہے۔ یہاں بھی دھرم کی خصوصیت سے ''دھرم پال'' نام تجویز کیا گیا ہے۔ وہ مذہب کو زندگی کی موجودہ ظاہری اور داخلی حقیقتوں کے آئینے میں دیکھنے کا قائل ہے۔ ناول کے اس رخ کو آنند لہر کی مذہب کے تعلق سے فلسفیانہ سوچ کو ناول میں تداخل سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ناول میں اس قسم کی مکالمہ نگاری مرکزی واقعے سے اس طور منسلک ہے کہ ناول کے باب میں مذہبی فلسفے کے متعلق اظہارات کی مختلف جہتوں کا احاطہ بھی بخوبی ہو گیا ہے۔

''ایشور کیا ہے؟'' ایک دن شیو نے دھرم پال سے پوچھا۔

کائنات کا شعور ہے جو پیدا بھی ہوتا رہتا ہے۔ جیتا بھی رہتا ہے اور مرتا بھی رہتا ہے۔ اس کا کوئی وجود نہیں مگر اس نے اتنی بڑی کائنات کو جنم دیا ہے جو خاموش ہے۔ لیکن لفظ پیدا کرتا رہتا ہے۔ جو ساکت ہے مگر ہر حرکت کا کارن ہے۔''

''آپ نے کچھ روز پہلے کہا تھا کہ آدمی شعور کا نتیجہ ہے مگر آدمی تو مر جاتا ہے۔''

''دیکھو شعور کی کیا خاصیت ہے۔ کچھ رنگ اگر ایک آدمی کے پاس ہوں تو وہ انھیں خلط ملط کر دیتا ہے۔ لیکن وہی رنگ جب ایک فنکار کے پاس ہوتے ہیں تو وہ اپنے شعور کے ذریعے تصویر کو جنم دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے، آپ تصویر کو مٹا سکتے ہیں لیکن وہ شعور کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہوا، پانی، آگ، مٹی اپنے اپنے شعور کے ذریعے مل کر انسانی جسم کو جنم دیتے ہیں۔ جسم مر جاتے ہیں اور نئے جسم جنم لیتے ہیں مگر وہ شعور کبھی ختم نہیں ہوتا۔''

آنند لہر کا یہ ناول فن ناول نگاری کے دلچسپ اور وقیع نمونے کے طور پر اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں اپنے مخصوص فنی آداب کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے ایک تخلیقی تجربے کے طور پر پیش کیا ہے جو بطور خاص اپنی مکالمہ نگاری، کردار نگاری اور ان کی رسمی

صفات کے تقاضوں کو متضاد رویوں کے ساتھ پورا کرتے ہوئے قارئین کی توجہ کو انگیز کرتا ہے۔ آنند لہر کرداروں کو واقعات کے عمل اور ردعمل کے طور پر یوں پیش کرتے ہیں کہ اس میں پوشیدہ ڈرامائیت جذبات کی جمالیاتی تشفی کے ساتھ ساتھ قارئین کے فکر وخیال کے دروں کو بھی وسیع کرتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات مل کر آنند لہر کو بطور ناول نگار مستحکم ادبی وقار کا حامل بنادیتی ہیں۔

نمونہ تحریر

سُریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے

ٹینک چلنے بند ہو گئے، توپیں خاموش ہو گئیں اور سپاہی ایک دوسرے کو مارنے کی بجائے مرہم پٹی کرنے لگے۔ ہر طرف سے ایک ہی آواز آئی، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے۔ دو فوجی یونٹیں سرحد کے آر پار تھیں۔ روشن اور حمید کی یونٹیں الگ تھیں، ملک الگ۔ مگر نہ جانے وہ کیوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ ایک دن روشن نے حمید سے کہا ''بھگوان کرے تمہاری میری دوستی یگوں تک قائم رہے۔'' حمید نے کہا ''یہ مت کہو بلکہ دعا کرو کہ دونوں ملکوں کی دوستی قائم رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملک دشمن ہو جائیں اور ہماری دوستی خود بخود دشمنی میں بدل جائے۔''

روشن نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا ''بانو کی یاد آتی ہے۔'' اس پر حمید نے کہا ''یاد تو اس کی آتی ہے جسے آدمی بھولا ہو۔ بانو تو ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔'' روشن نے کہا ''ٹھیک کہتے ہو تم۔'' اس پر حمید نے کہا ''تمہیں سریشٹا کی یاد تو آتی ہی ہو گی۔'' جواب دینے سے پہلے ہی سیٹی بجی، روشن اور حمید کو وہاں سے جانا پڑا۔ وہ پہلے دوست تھے پھر الگ الگ ملکوں کے سپاہی بن گئے۔ جو اپنے کمانڈروں کے حکم کے تابع ہیں۔ اگر حکم ملے تو ایک دوسرے کی جان بھی لینی پڑے۔ رات کو ادھر کے ملک والے کمانڈر نے پوچھا ''ہمیں اس فوج کے راز لینے ہیں، کس کی ڈیوٹی لگائیں۔'' نائب صوبعدار نے کہا ''حمید سے بہتر کون ہو سکتا ہے کیونکہ ویسے بھی حمید کی روشن نام کے لڑکے سے دوستی ہے۔'' ادھر کے کمانڈر نے بھی اپنے نائب صوبعدار سے ایسا ہی پوچھا۔ اس نے روشن کا نام لیا اور دلیل دی کہ ''ویسے بھی روشن کی حمید نام کے لڑکے سے دوستی ہے۔'' دونوں طرف کے کمانڈروں نے روشن اور حمید کی ڈیوٹی لگا دی۔ انہیں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع مل گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے مگر ایک دوسرے ملک کے راز نکالنے کے بجائے بانو اور سریشٹا کی باتیں کرنے لگے۔ گل نام کا سپاہی بھی اس یونٹ میں تھا۔ وہ بھی حمید کے گاؤں کا رہنے والا تھا مگر حمید کا سخت دشمن تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ گل بانو کو چاہتا تھا مگر بانو حمید سے پیار کرتی تھی۔ اور سچ بات تو یہ بھی ہے کہ اگر بانو حمید سے پیار کرتی تھی تو اس میں حمید کا کوئی قصور نہ تھا مگر گل کا بس چلے اور اگر جنگ ہو تو وہ دشمن کے سپاہی کو مارنے سے پہلے حمید کو ہی مار

دے۔ادھر نریش نام کا سپاہی بھی روشن سے جلتا تھا۔اصل میں سریشٹا روشن سے پیار کرتی تھی اور نریش اسے حاصل کرنا چاہتا تھا مگر ایسا ممکن نہ تھا۔یہی بات تھی کہ اگر نریش کا بس چلتا اور جنگ ہوتی تو وہ دشمن کے سپاہی کے بجائے پہلے روشن کو مارتا۔

جب سے روشن اور حمید کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا تھا، وہ سریشٹا اور بانو کے بارے میں باتیں کرتے مگر اپنے اپنے کمانڈروں کو یہی ظاہر کرتے کہ ایک دوسرے کے ملک کا راز جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔حمید نے روشن سے کہا ''بانو بہت خوبصورت ہے۔ میں اسے چاہتا ہوں۔ وہ اب بھی میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اکثر کہتی ہے کہ جنگ بری چیز ہے جس میں لوگوں کے گھر اجڑتے ہیں، سہاگ اجڑتے ہیں۔ بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔'' نریش نے کہا ''سریشٹا بھی یہی کہتی ہے، جنگ بیماری لاتی ہے۔غریبی لاتی ہے۔'' پھر ان دونوں کے ملنے کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ وہ بہت خوش تھے۔ ایک دن پھر روشن نے وہی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''سریشٹا بھی یہی کہتی ہے کہ فوجیوں کی بیویاں و مائیں و بہنیں جنگ کو نہیں چاہتی اور نہ ہی فوجی جنگ کو چاہتے ہیں کیونکہ فوجی جنگ لڑتے ہیں جنگ دیکھتے ہیں، اس لیے جنگ کا انجام بھی جانتے ہیں۔'' بس اس طریقے سے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔روشن اور حمید کو ایک۔ایک مہینے کے بعد اپنے اپنے کارناموں کی رپورٹ اپنے افسروں کو دینی تھی۔

پھر ایک دن حمید نے وہی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''پھر ایک دن جنگ کے خلاف ایک بہت بڑا اجلاس ہوا۔ کروڑوں روپئے خرچ کیے گئے، جنگ کی تباہی کے متعلق لوگوں کو بتایا گیا مگر بانو نے مجھ سے کہا ''میری ماں سے پوچھو جنگ کیا چیز ہے۔ وہ بتایا کرتی تھی کہ ہر روز کی طرح اس دن بھی صبح ہوئی۔ میری ماں نے ناشتہ بنایا۔نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس نے پھر چوڑیاں بھی کھنکائیں۔ میرے باپ نے انگڑائی لے کر ناشتہ کھانا شروع کیا مگر ریڈیو پر اعلان ہوا کہ چھٹیاں ختم ہو گئیں ہیں کیونکہ جنگ کا بگل بج چکا ہے۔ پھر وہ چلے گئے، واپس نہ آئے۔ ریڈیو پر خبر آئی کہ فوجی بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ میری ماں کو لگا کہ وقت جیسے ٹھہر گیا ہو مگر خبر ختم ہو گئی اور دوسری خبر آنے لگی۔ جنگ تباہی لاتی ہے۔عورتوں کے سہاگ چھینتی ہے۔'' بانو نے یہ بھی کہا کہ فوج میں بھرتی ہو رہے ہو۔ اتنا یاد رکھنا جسے تم دشمن سپاہی کہتے ہو، وہ بھی کسی کا سہاگ ہوتا ہے۔ کسی کا بھائی ہوتا ہے اور اس کے مرنے سے بھی کوئی عورت بیوہ ہوتی ہے۔'' جذبات میں

بہتے ہوئے بانو یہاں تک کہہ گئی کہ سپاہی جس ملک کا مرے، اس کی عورت بیوہ ضرور ہوتی ہے۔زمین نہ کم ہوتی ہے نہ آگے بڑھتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو' روشن نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا''سریشٹا بھی یہی کہتی ہے کہ دن اور رات کا وجود بھی جتنا تھا اتنا ہی ہے اور زمین کے کسی حصے کا کوئی بھی نام رکھ لو اس کے موسموں پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ قائم و دائم رہتے ہیں۔'' حمید نے کہا'' بانو نے یہ بھی کہا تھا کہ زمین کو بانٹ کر اس کی پریشانی نہیں بڑھانی چاہیے کیونکہ زمین تو آگے ہی کافی پریشان ہے۔اس پر سیلاب آتے ہیں، بھونچال آتے ہیں۔''

ایک دن حمید کو بانو کا خط آیا، حمید نے خوشی سے اسے زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ بانو نے لکھا تھا۔''میں تمہیں یاد کرتی ہوں۔ دروازے کھلے رکھتی ہوں تا کہ تم جب بھی آؤ تمہیں اندر آنے میں دیر نہ لگے، تمہاری خوبصورت آنکھیں میرے چہرے کے ارد گرد گھومتی رہتی ہیں۔'' گل نے یہ سنا اور آگ بگولا ہو گیا۔اسے روشن نہیں بلکہ حمید اپنا سب سے بڑا دشمن لگنے لگا۔اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ حمید سے ضرور بدلہ لے گا۔''مگر کس بات کا بدلہ۔'' کتا بھونکا گویا اس سے پوچھ رہا ہو اگر بانو حمید سے پیار کرتی ہے تو حمید کا قصور کیا ہے۔ادھر سریشٹا کا خط روشن کو آیا۔روشن بھی پاگل سا ہو گیا۔وہ زور زور سے خط کو پڑھنے لگا۔سریشٹا نے لکھا تھا''جب سے تم گئے ہو نہ کھانے کا مزہ ہے اور نہ پانی کا۔ بہار آئی ہے مگر تمہارے بغیر لگتا ہے کچھ بھی نہ ہوا ہے۔ صرف موسم بدلا ہے۔ ہر روز اپنے پلو سے تمہارا راستہ صاف کرتی ہوں۔'' نریش ادھر آگ بگولا ہو گیا۔اسے محسوس ہوا کہ اس کا سب سے بڑا دشمن حمید نہیں بلکہ روشن ہے۔ وہی کتا ادھر جا کر بھونکا اور کہنے لگا کہ مجھے یہ بتاؤ اگر سریشٹا روشن سے پیار کرتی ہے تو اس میں روشن کا کیا قصور ہے۔ مہینے کے آخری دن وہ دونوں پھر سرحد پر بیٹھ کر سریشٹا و بانو کی باتیں کرنے لگے۔حمید نے کہا'' نہ جانے بانو کو کیسے معلوم ہو گیا کہ تم میرے دوست ہو۔'' روشن نے کہا''تمہاری اور میری دوستی کا علم سریشٹا کو بھی ہو گیا۔'' حمید نے کہا۔بانو نے اپنے خط میں لکھا ہے''تم پار والے ہر جوان کو روشن سمجھنا اور یاد رکھنا کہ ایک گولی جو کسی سینے پر لگتی ہے بے شمار رشتوں کو تحس نحس کرتی ہے اور دکھ و درد کسی سرحد کو نہیں مانتے اور یہ بھی نہیں ہوتا کہ سرحد کے اس پار مرنے والے سپاہی کی عورت بیوہ ہو گی اور سرحد کے اس پار مرنے والے سپاہی کی عورت بیوہ نہیں ہو گی۔''

''دکھاؤ بانو کا خط۔'' ''تم دکھاؤ سریشٹا کا خط۔'' حمید بانو کا خط روشن کو دکھانے لگا اور پھر پڑھنے لگا۔ بانو نے لکھا ہے ''جنگ سہاگ اجاڑتی ہے، دکھ لاتی ہے، بھوک لاتی ہے۔''

اتنی دیر میں گل نے کمانڈر سے کہا ''وہ دیکھو صاحب حمید روشن کو اپنے ملک کے نقشے دکھا رہا ہے، یعنی کہ ملک کے ساتھ غداری کر رہا ہے۔'' کمانڈر نے گولی چلائی جو سیدھے حمید کو لگی، وہ مرتے ہوئے کہنے لگا ''بانو نے لکھا ہے'' ادھر نریش بھی اپنے کمانڈر کو لایا۔ اس نے بھی کمانڈر کو یہی بات بولی۔ پھر روشن پر گولی چلی اور مرتے ہوئے روشن نے حمید سے کہا۔

''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے۔''

نام: محمد ایوب

قلمی نام: شبنم

والد: خواجہ قمر الدین لون

پیدائش: ۵، جون، ۱۹۴۸ء بمقام سورنکوٹ پونچھ

تعلیم: بی۔اے

ادبی زندگی کا آغاز؛ کالج کے زمانے سے

کتابیں: شاہین (افسانوی مجموعہ) ادبیات پونچھ (تاریخ و تحقیق)

پیشہ: صحافت

ذریعہ اظہار: اردو۔ پہاڑی

مدیر اعلیٰ: ہفت روزہ ''ستاروں سے آگے'' سورنکوٹ

پتہ: Shabnam Medicate Near Sub District Hospital,Main Bazar,Surankote,poonch.185121

موبائل: 9419675572

ایوب شبنم

محمد ایوب شبنم کا شمار اپنے عہد کے ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے بیک وقت ادبی خدمات کی کئی راہوں کا ایک ساتھ تعین کیا اور منزل تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، محقق اور صحافی ہیں۔ اپنے افسانوی مجموعے ''شاہین'' میں ''حرف آغاز'' کے عنوان سے انہوں نے جو تحریر لکھی ہے، وہ توجہ طلب ہے اور کافی حد تک ان کے نظریۂ ہائے ادب کے مختلف ہونے کے دلائل پیش کرتی ہے۔ اس کی چند سطریں خدمت میں حاضر ہیں۔

''اس کتاب کی ترتیب، تدوین اور اشاعت سے اس ہیچدان کو نہ اپنی کسی قابلیت علمی کا اظہار مقصود ہے، نہ لیاقت علمی کا اعلان منظور ہے، نہ دنیاوی نام ونمود کی خواہش ہے اور نہ اپنی ذاتی شہرت کا ارمان ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔

بھلا ہی دیتی ہو جس کو دنیا، مٹا ہی دیتا ہو جس کو گردوں

عبث ہے انسان چاہتا ہے، جو نام ایسا، نشان ایسا

سچ مانئے، مجھے خود علم نہیں کہ میں نے کس جذبے کے زیر اثر لکھنا شروع کیا ہے، یا وہ کون سا حادثہ تھا، جس نے مجھے ادبی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ جہاں تک زبان دانی کا تعلق ہے، پہاڑی خطہ کا مکیں ادبی زبان کے کوائف سے بے خبر ہو تو مذائقہ نہیں۔ یوں بھی تو سائنس اسٹوڈنٹ اور ادب کی آپس میں نسبت نہیں۔ پھر بھی اس تحریر میں اپنے جذبات و احساس کا اظہار کر رہا ہوں کہ شائد میری اس مخلصانہ کوشش سے دم توڑتی ہوئی اردو زبان کی زندگی میں چند لمحات کا اضافہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہو سکا تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ میری تحریر میں دوسری خامیوں کے علاوہ ریپیٹیشن بھی ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی اپنی تصنیف کو منظر عام پر لانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اب آپ کا یہ فرض بنتا ہے کہ اپنے بے لاگ تنقیدی تبصروں سے مجھے مطلع

فرمائیں۔'' (شاہین، از۔محمد ایوب شبنم، ص، ۴، ۳)

محمد ایوب شبنم کا یہ افسانوی مجموعہ اپریل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ تمام شامل افسانے شخصی خاکوں کی ہیت میں لکھے گئے ہیں اوران میں جو قصے بیان کئے گئے ہیں، وہ شاید اس شخص کی زندگی یا تجربے کے کسی اصل واقعے سے تعلق رکھتے ہیں جسے ایوب شبنم نے اپنی فنکاری کے مواد کا استعمال کر کے مزید افسانوی اضافے کے ساتھ ایک مکمل افسانے کی شکل عطا کر دی۔ان کے عنوانات بھی منفرد ہیں مثلاً'' کائنات شرما اٹھی (جناب شمیم احمد شمیم کے نام)''میں مجبور ہوں (م۔ق۔خان کے نام)'موت کے سائے (سرینگر کی حسین شاموں کے نام)'لاٹری (ننھے منے بھتیجے طارق کے نام)'' وغیرہ۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایوب شبنم نے جہاں بڑی بڑی شخصیات کو یاد رکھا ہے، وہیں خوبصورت وادی اور اپنے بھتیجے کے آئینے میں بچوں کی فطرت کی بھی عکاسی کی ہے، چھوٹی سائز کے ۱۱۲، صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ۱۱، افسانے ،حرف آغاز، از۔مصنف، تعارف، از۔محمد الدین بانڈے اور ایک نظر، از۔رہبر حیدر ہیں۔

۱۹۷۲ء میں شایع اس مجموعے کے تمام افسانے ظاہر ہے کہ ۷۲ء یا اس سے پہلے کی تخلیق ہیں۔یہ دور وہ تھا کہ افسانوی ہیئت کے نئے نئے اسالیب خواہ وہ تخلیقی سطح پر موضوع و مواد کے اعتبار سے ہوں یا پھر تکنیک کی سطح پر، بہر حال کسی نہ کسی طور کی تبدیلی سے ضرور دو چار تھے اور تخلیقی ذہنوں کو متاثر کر رہے تھے، جس کا ثبوت ایوب شبنم کے مندرج بالا''حرف آغاز سے ہی فراہم ہو جاتا ہے۔لیکن یہ تمام افسانوی تخلیق کے مدارج کا ہی اہم حصہ ہیں۔کسی کو بھی ان سے الگ ہٹ کر یا منفرد طور پر دیکھنے سے اس کی ایک زمانی قدر کے علاوہ کوئی مزید انفرادیت قائم کرنا ایک طرح سے ناممکن عمل ہے۔مہدی جعفر نے اس ضمن میں بہت عمدہ بات کہی ہے۔

''روایتی اور نئے افسانوں کے درمیان جو کچھ فرق ہے، وہ بھی طریقہ کار یا پر اسس کی سطح پر ہے، جسے کوئی تکنیک کا فرق کہتا ہے، تو کوئی ٹریٹمنٹ کا فرق سمجھتا ہے۔صاف ظاہر ہے کہ تکنیک بنیادی طور پر میکانکی ہوتی ہے اور چونکہ میکانکیت کا ڈھانچہ متعین ہوتا ہے، اس لئے عمومی

حیثیت رکھتی ہے۔ جب کہ ہر افسانہ اپنی تخلیق کی انفرادیت کی وجہ سے ایک نئے اور اور مختلف طریق کار کا متقاضی ہوتا ہے، جسے فراہم کرنا افسانہ نگار کی ذمہ داری ہے۔ کم وبیش یہی حال ٹریٹمنٹ کا ہے۔ اس لئے کہ ٹریٹمنٹ بھی میکانکی حیثیت رکھتا ہے۔ طریق کار افسانہ نگار کے شعور اور میکانکی عوامل کو ایک سطح پر، تو تخلیقی ابال کے فطری اور طبعی عوامل کو دوسری سطح پر بروئے کار لاتا ہے۔ علاوہ بریں طریق کار میں جو کنٹرول کام کرتا ہے، وہ خود بھی بڑھتے اور پھیلتے ہوئے افسانوی مادے کو ڈھالنے اور تشکیل دینے میں افسانہ نگار کی منفرد خصوصیتوں کو بہ طرح خاص استعمال کرنے میں لگا رہتا ہے۔ چنانچہ تکنیک اور ٹریٹمنٹ کے عناصر پر اسی ہی کا حصہ قرار پائیں گے۔''

(نئی افسانوی تقلیب ، از۔ مہدی جعفر، ص، ۱۲)

محمد ایوب شبنم نے اپنی ادبی صلاحیتوں سے جس طور اس خطۂ پیر پنچال میں اردو ادب کی خدمات انجاب دی ہیں، وہ قابل رشک ہیں۔

جنگ

(محترمہ اندرا گاندھی کے نام)

کیپٹن پرکاش بستر میں اُتھل پتھل ہو رہا تھا۔اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا وہ مسلسل ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جیسے کسی سے لڑ رہا ہو۔اچانک چیخ مار کر جاگ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے کی ہر شئے کو دیکھنے لگا۔اس کی پیاری بیوی پدمنی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور پرکاش کا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا کہ ''کیا بات ہے پرکاش۔یہ چیخ کیسی تھی۔تمہیں پسینے کیوں چھوٹ رہے ہیں۔تم سہمے سہمے کیوں ہو۔؟'' ''میں نے بہت ڈراونا خواب دیکھا۔پہلی جنگ عظیم سے لیکر آج تک جتنی جنگیں ہوئی ہیں، میں نے سب کو خواب میں ایسے دیکھا ہے جیسے کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔'' پدمنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔''مجھے بھی تو سناؤ۔''

پرکاش نے لمبی سانس لی۔''پدمنی،ایک تہذیب مٹ رہی تھی تو دوسری بن رہی تھی عروج وزوال برسرِ پیکار تھے۔۱۸۵۷ء کے وہ منحوس دن تھے۔سرزمین ہندوستان پر منڈلاتے سفید بادل کتنے بھیانک لگ رہے تھے۔دفعتاً بادل چھٹ گئے۔اب ان کا رخ یورپ کی طرف تھا۔ایک زبردست طوفان آیا۔امریکہ،انگلستان،جرمنی،فرانس اور دیگر ممالک تہ و بالا ہونے لگے۔یورپی سمندر میں اٹھنے والا طوفان اتنی بھیانک شکل اختیار کر چکا تھا کہ اس کی تہذیب شکن لہریں ایشیا تک پھیل گئی تھیں۔ہیروشیما اور ناگاساکی صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔تھیٹر کے پردے پر ایک اور غمناک سین شروع ہو گیا۔ایک طرف جنت بے نظیر قبرگاہ میں تبدیل ہو گئی۔ایک جسم دو ٹکڑے ہو گئے فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے، بھارت کے مشرق اور مغرب میں خونی لہریں پھیل گئیں، کہیں پاکستان کا نام لیا جانے لگا۔پھر ۱۹۴۸ء کا منظر سامنے آیا۔ایک بار پھر پردے پر تاریکی چھا گئی،لیکن چھوٹی چنگاریاں اب بھی سلگ رہی تھیں۔

وقت نے کروٹ لی۔شیطان نواز یورپی طاقت کے نشہ میں سرزمین عرب کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ برطانیہ، امریکہ، فرانس وغیرہ نے مل کر مصر پر حملہ بول دیا، لیکن خالد عمر کی بنائی ہوئی دیوار اتنی کمزور نہ تھی۔یورپی درندوں کو غرق ہونا پڑا۔فلسطین ابھر کر پردۂ کائنات پر آ گیا۔لاکھوں فلسطینی کھلے آسمان کے نیچے بھوکے ننگے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ایک نئی جنگ کی تیاری شروع ہو گئی۔دفعتاً سپر جیٹ اسٹار فائٹر کشمیر پر پرواز کرنے لگے۔یہ ۱۹۶۵ء تھا۔ہزاروں پاکیستانی گوریلے سنگینیں لئے کشمیر میں گھس آئے۔ہندی فوج وطن کے لئے لڑ رہی تھی۔جنگ کا دیوتا اپنے فرصت کے لمحات گزارنے ایک بار پھر سرزمین عرب میں داخل ہو گیا۔چند ہی دنوں میں فلسطینی اور اردنی فوج کی خانہ جنگی نے پچاس ہزار انسانوں کو موت کا نوالہ بنا دیا۔امریکی اور اسرائیلی ایوانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔'' کیپٹن پرکاش دم لینے کے لئے رکا۔آج میں نے دیکھا کہ تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔مجھے اچانک محاذ پر بھیج دیا جاتا ہے۔میں اپنا نیٹ تیارہ لیکر شاہین کی طرح جھپٹتا ہوں دشمنوں کی صفوں میں تباہی مچ جاتی ہے، میرا جہاز بھی زخمی ہو کر نیچے گرنے لگتا ہے۔میں خوف زدہ ہو کر زمین کی طرف دیکھنے لگتا ہوں لیکن آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔'

پدمنی کے چہرے پر چند منٹ کے لئے مردنی چھا گئی، لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔''نہیں پرکاش، یہ تمہارا وہم ہے۔اب کوئی جنگ نہیں ہوگی۔'' صبح ہونے پر پرکاش اپنی ڈاک دیکھنے لگا، ایک تار فارم تھا۔اس نے پدمنی سے کہا۔''ڈارلنگ، خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔امرجنسی کال ہے۔مجھے آج ہی واپس جانا ہوگا۔اینٹی ٹینک اور کرافٹ گنز آگ اگل رہی تھیں زمین پر لوہے کے پہاڑ دوڑ رہے تھے، پرکاش کے نیٹ جہاز نے دشمن خیمے میں تباہی مچا دی تھی، اس کا جہاز آگ کی زد میں آ کر نیچے گرنے لگا۔وہ پیراشوٹ کے ذریعے کود گیا۔وہ نیچے زمین کی طرف آ رہا تھا۔توپوں کی گنگناہٹ بدستور جاری تھی۔

نام: امتیاز نسیم ہاشمی

قلمی نام: امتیاز نسیم

پیدائش: ۱۲، جولائی ۱۹۶۹ء

مقام: کھوریا (پاک مقبوضہ کشمیر)

تعلیم: ایم، اے، اردو

تصانیف: چٹکار (پہاڑی شعری مجموعہ)

انعام: کلچرل اکیڈمی جموں و کشمیر

پیشہ: لکچرار، اردو

ذریعہ اظہار: اردو، پہاڑی، گوجری

پتہ Mauza Natol Chatral

Mehndhar poonch

نمونہ کلام

غزل

کوئی کہتا ہے رات بھاری ہے
چار جانب سکوت طاری ہے

اک سمندر ہے ،اور پیاسا ہے
ایک دریا ہے، بے قراری ہے

ہم نے دیکھا ہے آئینہ جتنا
ہم میں اتنی ہی خاک ساری ہے

ایک تم ہی نہیں اکیلے تھے
رات ہم نے بھی تو گزار ہے

سائے گھٹتے ہیں اور بڑھتے ہیں
ہم کو سورج سے شرمساری ہے

ایک تم ہو کہ بس نہیں چلتا
باقی دنیا تو سب ہماری ہے

امتیاز نسیم ہاشمی

امتیاز نسیم ہاشمی کی شاعری میں جہاں دنیاوی مسائل کی عکاسی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے، وہیں عشقیہ مضامین کو بھی انہوں نے پوری کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔اس طرح وہ ہمارے ان شاعروں کی صف میں شامل ہیں ،جنہوں نے عشق و محبت کے مضامین باندھنے کے ساتھ ساتھ اپنے اشعار کو دیگر معانی سے بھی ہم کنار کیا ہے۔ان کے یہاں سچی چاہت ،اس کا کرب اور عشق کی شدید کیفیات کا احساس ہوتا ہے۔ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب بھی پیغام ترا لے کے صبا آتی ہے۔
اک امنڈتی ہوئی ہونٹوں پہ دعا آتی ہے
میں تو صحرا تھا،مگر سبز ہوا چاہتا ہوں
جانے کس جسم کو چھو کر یہ ہوا آتی ہے

اشعار میں موجود خود سپردگی و محویت، ان کا ایک سنبھلی ہوئی کیفیت کے ساتھ اظہار ان کے نرم خلوص اور غم کو برداشت کرنے کی صلاحیت کے عناصر کو نمایاں کرتا ہے،جس نے کلام میں بہت اثر پیدا کر دیا ہے۔وہ دوسرے موضوعات ،جن پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے،اس میں اخلاقی پہلوؤں پر زیادہ زور ملتا ہے۔اس طرح ان کی شاعری ایک متوازن فکر کی غماز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنا ایک وسیع مقصد بھی رکھتی ہے۔آج کے دور جس میں ادب اور تہذیب کے متعلق بہت کچھ قدیم تصورات کے اعتبار سے تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، میں ہنگامی شاعری کر کے کچھ وقتوں کے لئے سستی شہرت تو حاصل کی جا سکتی ہے،لیکن احتیاط اور اعتدال والی شاعری کی اہمیت اور عمر زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔امتیاز نسیم ہاشمی کی شاعری بھی اسی قبیل کی ہے۔

نام: ڈاکٹر محمد آصف ملک

پیدائش: ۴، اپریل ۱۹۸۱، بہروٹ شریف، بڑی درہال، تحصیل درہال ملکاں، ضلع راجوری

تعلیم: ایم۔اے، ایم،فل، پی، ایچ ڈی (اردو)

تصانیف: عاصی، شخص اور شاعر

غالب، لسانیاتی وضع متن و معنی اور شعری نظام

اقبال کی شعری لسانیات

پیشہ: اسسٹنٹ پروفیسر، باباغلام شاہ بادشاہ

یونیورسٹی، راجوری

پتہ: Dept.of Urdu,Baba Ghulam Shah Badshah

University,Rajouri.185234 (Jammu And Kashmir)

موبائل: 9906947789

9858793959

ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی

ڈاکٹر آصف ملک علیمی خطہ پیر پنچال کے ابھرتے ہوئے نثر نگار ہیں۔ موضوع لسانیات میں ان کی بہت دلچسپی ہے۔اسی لئے ان کے زیادہ تر مضامین میں لسانیاتی تراکیب پر گفتگو زیادہ ہے۔مثلاً ان کی کتاب ''غالب: لسانیاتی وضع ،متن ومعنی اور شعری نظام'' میں شامل ابواب میں سے چند کے عنوانات ملاحظہ ہوں۔

''غالب کا لسانیاتی ومعنیاتی نظام اور فلسفہ صرف ونحو

کلام غالب اور مرکب افعال کا لسانی دائرہ کار

کلام غالب میں مصدر کا برتاؤ (امری، فاعلی، مفعولی اور تکمہ خبر کے حوالے سے)

کلام غالب میں فعل حال ومضارع کی ہیتیں''

اسی طرح اپنی کتاب ''اقبال کی شعری لسانیات (تحقیق، تجزیہ اور تفہیم) میں شامل ابواب میں سے بعض کے عنوانات یہ رکھے ہیں۔

''اقبال اور فعل ناقص کا لسانی تصور 2 اقبال اور امدادی فعل کا فنی لسانی برتاؤ

3 اقبال اور فعل حال کا برتاؤ 4 اقبال اور فعل امر کی معنوی وسعت''

لسانیات کے علاوہ بھی انہوں نے شاعر اور شاعری کے خصائص اور رد وقبول کے عناصر بیان کرنے کے لئے نثر کے دوسرے اسلوبوں سے بھی کام لیا ہے۔اس کی بہترین مثال ان کی کتاب ''عاصی: شخص اور شاعر'' ہے۔ودیا رتن عاصی جو کہ شاعر کی حیثیت سے جموں کے صفحہ اول میں اور اردو ادب کے نمائندہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں، کے فن اور شخصیت کو سمجھنے کی ضمن میں آصف ملک صاحب کی یہ کتاب سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔یہ نوجوان تخلیق کاروں میں بہت نمایاں نام ہے۔

نام: اسلم مرزا

پیدائش: یکم نومبر ۱۹۵۶ء راجوری

تعلیم: ایم اے، بی، ایڈ

پیشہ: سابق مدرس

انعام: بیسٹ ٹیچر ایوارڈ

پتہ: Dhanidhar,Rajouri

نمونہ کلام

مشغلہ اور مجبوری

برہنہ!
بعض نیم برہنہ
مقابل حسن میں۔۔
شمولیت کرنے والی حسیناؤں کے
رنگین پوسٹر
شہر کے مصروف ترین راستو!
اور چوراہوں ہر
کسی کو بے پرد، فحش
اور کسی کو
نہایت دلکش دکھائی دیتے تھے۔
شہر کے آخری موڑ پر آویزاں
اسی طرح کی نیم عریاں
قد آدم ہورڈنگ کے نیچے
فٹ پاتھ پہ بیٹھی
بازار سے خرید کر لائی
دودھ، دال آٹا، تیل
صابن کی ٹکی!
نمک کی گوتھی!!
اور ایک جوڑی۔۔۔
پلاسٹک کی جوتی۔۔۔
کا کر رہی تھی اپنی نازک انگلیوں پر صاحب
نیم برہنہ ایک مزدور عورت
ایک راہگیر کی گھورتی نظر میں
اس کی نظروں سے جا ٹکرائیں
وہ بوکھلا اٹھی۔۔۔
سر کے اوپر آویزاں
فحش پوسٹر کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے بے ساختہ بول اٹھی
نمائش حسن میں شرکت کرنے والی ترقی یافتہ
ان حسیناؤں کی طرح
جینا تو میرا مشغلہ نہیں ہے، اے بابو!
مجھے تو اپنا جسم ڈھانپنے کے لئے
میسر کپڑا ہی نہیں ہے۔

اسلم مرزا

اسلم مرزا راجوری کے ادباء شعرا میں ایک نمایاں نام ہے۔انہوں نے اردو کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے،لیکن نظم اور افسانوں کی جانب ان کا رجحان زیادہ ہے۔ان کی نظموں میں جذباتی زندگی کی اہمیت، عقلی اور منطقی فکر سے زیادہ ہے۔ان کے نزدیک علم وادب کی برتری کا فریب نظام جذبات کے فکریہ عناصر کو متاثر کرتا ہے اوراس طرح اصل حقیقت یا تو پوشیدہ رہتی ہے یا پھر آدھی ادھوری شکل میں سامنے آتی ہے، جو کہ آج کے زمانے کی ایک تلخ اور مکمل حقیقت ہے۔ان کی نظم ''مشغلہ اور مجبوری'' کی آخری چند سطریں دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

نیم برہنہ ایک مزدور عورت
ایک راہگیر کی گھورتی نظر میں
اس کی نظروں سے جاٹکرائیں
وہ بوکھلا اٹھی۔۔۔
سر کے اوپر آویزاں
فحش پوسٹر کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے بے ساختہ بول اٹھی
نمائش حسن میں شرکت کرنے والی ترقی یافتہ
ان حسیناؤں کی طرح
جینا تو میرا مشغلہ نہیں ہے
اے بابو!

مجھے تو اپنا جسم ڈھانپنے کے لئے

میسر کپڑا ہی نہیں ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا حدف تنقید وہ روشن خیالی انقلاب پر عمل اور اس خواب کی الٹی تعبیریں ہیں۔ یہاں فرانس کے روشن خیالی انقلاب کی جانب توجہ منعطف ہوتی ہے، جس سے رونما ہونے والے اثرات کے متعلق کہا گیا تھا:

''فرد کا رشتہ خدا سے، اپنے آپ سے، اپنے محبوب سے، اپنے فن یا ہنر سے باقی نہیں رہ گیا اور وہ تمام اشیا میں صرف ایک تجرید سے نسبت کے شعور کا مالک رہ گیا''

اسی تجرید سے نسبت کے شعور کو اسلم مرزا نے اس مفلس مزدور عورت کی زبانی بیان کیا ہے جس میں ادا اور مجبوری کی حد فاصل محض کشادگی اور تنگدستی یا یوں کہیں کہ تنگ دستی کی ابتریں صورت میں اپنا اصلی روپ دکھاتی ہے۔ اسی طرح ان کی ایک اور بہترین نظم ''کیا پیغام دوں'' ہے، جس میں فرد اور زمانے کے مسائل اپنی شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ دراصل اسلم مرزا نے گرد و پیش کی زندگی کے تقریباً ہر مظاہر کو نظریات کی شکل میں دیکھا ہے۔ انہیں احساس ہے کہ جذباتی زندگی کے فقدان نے ایسے معاشرے کی تشکیل کی ہے جہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ محمد علوی کا شعر یاد آتا ہے۔

برہنہ بھٹکتا تھا سڑکوں پہ میں

لباس ایک سے اک دو کانوں میں تھا

اسلم مرزا نے اپنی نظموں میں فرد اور سماج کے متعلق جو مشاہدات بیان کئے ہیں وہ ان کی زبان و ادب اور اس میں برتے جانے والے موضوعات پر ان کی تخلیقی دسترس کے آئینہ دار ہیں۔

نام: پرتپال سنگھ
تخلص: بیتاب
تاریخ پیدائش: ۲۶، جولائی ۱۹۴۹ء
مقام: کھڑی دھرم سال، پونچھ
تعلیم: ایم۔اے (سیاسیات)، ایل، ایل، بی
پیشہ: رٹائر آئی۔اے۔ایس، آفیسر
تصنیفات: پیش خیمہ۔سراب در سراب، خودرنگ
(مجموعہ نظم وغزل) کیکٹس (مجموعہٗ
غزل بہ حروف دیوناگری) دی تھرڈ
اسٹرینڈ (اردو نظموں کا انگریزی
ترجمہ) موج ریگ، نظم اکیسویں صدی
انعامات: جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی ایوارڈ
بخشی غلام محمد ایوارڈ
یو۔پی اردو اکیڈمی ایوارڈ اور دیگر
پتہ: 70/10 A-1 South
Extention trikuta nagar
Jammu-18001
موبائل نمبر: 9419180824

شکست کا نشہ

مزاج کی، تحریر کی، تقریر کی
سوچ کی، عمل کی کچھ خامیاں تھیں
جنہیں میں اپنی خوبیاں سمجھتا رہا
جن پر میں ناز کرتا رہا! جو میرے لئے
راحت بخش تھیں، دوسروں کے لئے
تکلیف دہ
اک عمر کے بعد محسوس ہو رہا ہے کہ اگر
میں نے
اپنی خامیوں پر وقتاً فوقتاً فخر نہ کیا ہوتا
بلکہ ان پر قابو پایا ہوتا
تو آج میں جہاں ہوں
اس سے بہت آگے ہوتا
اب تو اتنی مہلت ہی نہیں
کہ وہ سب دوبارہ ہو سکے
اب تو باقی بھی اسی شان میں
گزر جائے تو اچھا ہے
کم سے کم دوسروں کو تو پتہ نہیں چلے گا
کہ میں نے جس نشے میں زندگی گزار دی
وہ دراصل فتح کا نہیں، بلکہ شکست کا نشہ تھا

پرتپال سنگھ بیتاب

پرتپال سنگھ بیتابؔ نے اپنے مجموعہ نظمیات ''نظم اکیسویں صدی'' میں لکھا ہے:

''بیسویں صدی کے ہمارے زیادہ تر پیش رو جا چکے ہیں، اور کچھ جانے والے ہیں۔ ہم اور ہمارے ہمعصر بھی اکیسویں صدی میں بہت دور تک نہ جا سکیں گے۔ اس لیے میں اپنی یہ نظمیں اکیسویں صدی کی اگلی نو دہائیوں پر محیط قارئین و نقادان اردو ادب کی نذر کرتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ وہ اپنی تمام تر نئی سوچ، وسیع سائنسی نظر اور اپنے عہد کے مکمل غیر جانب دارانہ پیمانوں کی کسوٹی پر انھیں پرکھیں گے اور ایسا کرتے ہوئے بیسویں صدی میں پیدا ہونے والی میری اس سوچ کا بھی احاطہ کریں گے کہ مجھے یہ نظمیں سو سال بعد لکھنی چاہیے تھیں۔''

اس نقطۂ نظر سے ان کی نظم ''نظم اکیسویں صدی'' کی چند سطروں کا بھی مطالع کیا جائے۔

ہم جو پاش پاش ہیں
کسی مہیب غار کی تلاش میں ہیں گامزن
ہم جو پل صراط سے گزر گئے
تو یہ صدی تمام پیچ و تاب سمیٹ کر
سیہ سفید میں نمود پائے گی
اور ہم جو آتشیں سراب میں بھٹک گئے
تو دیکھنا یہ دھوپ
سات سلسلوں میں ٹوٹ پھوٹ جائے گی

(نظم اکیسویں صدی)

جب ہم ان کے پورے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم مجموعہ میں کل کی حیثیت رکھتی ہے اور باقی نظمیں اس کی جز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نظم کا ہر مصرعہ اپنے آپ میں نئی صدی اور اس کے متعلقات کے اعتبار سے سوالوں کا ایک مہیب سلسلہ رکھتا ہے جن کے جوابات تلاش کرنا ہمارے اور آگے کے عہدوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ یقیناً شاعر کا یہ کام نہیں ہے۔ اس کا منصب بھی نہیں ہے کہ وہ نئی صدی کے ان سوالات و جوابات کی جستجو اپنے اوپر لازم کرلے۔ لیکن اس جانب نشاندہی کو میرے خیال میں اگر اس کے آزادانہ تخلیقی رویوں پر مسلط نہیں تو سماج کے تعلق سے ادبی سروکاروں اور تقاضوں میں ضرور شامل کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس نقطۂ نظر کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے پرتپال سنگھ بیتابؔ نے اپنی نظم اور مجموعۂ کلام کا عنوان تجویز کیا ہو۔ صدیوں، سالوں، مہینوں، دنوں، گھنٹوں اور لمحوں میں سفر کرتی ہوئی زندگی اور اس کے مشاہدوں کے آئینے میں آگے کے زمانوں کا موضوعاتی انتخاب کے ساتھ بیان پرتپال سنگھ بیتابؔ کو ہمعصر شعرا میں مختلف مقام کا حامل بناتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی بعض نظموں کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''ہواؤں کا پیغام'' ملاحظہ ہو ۔

ہواؤں کا پیغام
اڑنے سے پہلے
نہیں پاؤ گے
پانیوں پر منقش جو تحریر ہے
ساحلوں سے دکھائی نہیں دے سکے گی
زمینوں سے اپنا تعلق
اگر توڑ لو
تو خلا در خلا۔۔۔
بیکراں پانیوں کے پیامات کو
جاننے کا ہنر سیکھ لو گے

(ہواؤں کا پیغام)

اس نظم کا بنیادی لہجہ خطابیہ ہے اور خطاب کے جو بھی لوازمات ہیں مثلاً ماضی کی روایت

کا درس، حال کی نشاندہی اور مستقبل میں کامیابی کے لیے منصوبوں اور جوش وخروش کا اظہار۔ یہ تمام صفات اس نظم میں موجود ہیں۔ اس طرح ماضی، حال اور مستقبل میں جو تسلسل ہے وہ حزنیہ اور طنزیہ عناصر جو خطابیہ نظموں کا عام طور پر خاصہ ہوتے ہیں، اس میں نہیں ہیں ہاں دعائیہ عناصر تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے ایک قدم آگے دیکھیں تو طنزیہ اور حزنیہ عناصر سے ماورا استفہامیہ عناصر ضرور محسوس ہوتے ہیں یا محسوس کیے جا سکتے ہیں جو دریافت کے عمل کو مزید تقویت دیتے ہیں۔ دراصل پرتپال سنگھ بیتاب کی یہ نظم آنے والے زمانوں میں ان جرأت مندانہ افراد سے مخاطب ہے جو مسائل کے زہر ہلاہل کو پی کر بھی یا پی کر ہی "اور، اور" کا نعرہ بلند کرنے کے ساتھ آنے والے زمانوں میں کامیابی کے مراحل طے کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ سائنسی نقطۂ نظر سے ہو یا فلسفیانہ نکتہ نظر سے۔ یا زندگی اور مابعد الطبیعات کے کسی بھی گوشے کے تعلق سے۔ ان کی نظموں کے کینوس پر مزید غور کرنے کے لیے ان کی ایک نظم "ہمارے بعد" کو دیکھا جائے۔

ہمارے بعد
جو بھی آئے گا
ہمارا حشر اس کے واسطے
حیات کی کتاب کا ورق ہے وہ
سبق ہے وہ
کہ جس کو ایک منچلا امیدوار
امتحاں کے ہال میں تولے گیا
مگر سوال ہی نہ تھا وہ امتحاں میں
جس کا وہ جواب تھا

(ہمارے بعد)

اس نظم کے تحت الفاظ میں جو حزنیہ اور طنزیہ کیفیت ہے اور روایتی قدروں اور آج کی مثبت اور کافی حد تک روایت کے اعتبار سے منفی کا بھی جو منظر نامہ آنے والے وقتوں کے پس منظر میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک طرح کی خود ترحمی (Self Pity) کے جذبات کو بھی ابھارتا ہے۔ دراصل ان کا یہ نظریہ حسی ادراک کے معروضی ارتباط کے زیر اثر دنیا کے دیگر ادبی اور سماجی سلسلوں

کی زندہ روایتوں کے شعور اور مختلف تخلیقی ادوار کے درمیان مشاہداتی طور پر محسوس کیے جارہے زمانی بعد کا مرہون منت ہے۔ اس سلسلے میں قدیم یونانی شاعر ہومر کے تعلق سے ایک روایت کا ذکر خالی از دلچسپ نہ ہوگا۔ اس روایت کی رو سے بوڑھا ہومر ارکیڈیا کے ساحل پر واقع ماہی گیروں کی ایک بستی تک پہنچا اور سوال کیا کہ:

''اے ارکیڈیا کے ماہی گیرو! کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟''

اس سوال کے جواب میں انھوں نے ایک پہیلی کہی۔

''جو کچھ ہم نے پکڑا تھا، وہ پیچھے چھوٹ گیا، البتہ جو ہم نے نہیں پکڑا، وہی ہمارے پاس ہے۔''

(بحوالہ الیٹ کا اردو دنیا میں خیر مقدم، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، شب خون شمارہ ۲۰۵، بابت اپریل ۱۹۹۷ء ص ۵۱)

ممکن ہے پرتپال سنگھ بیتاب کی نظر سے یہ روایت نہ گزری ہو یا اگر گزری بھی ہو تو شعوری یا لاشعوری طور پر اس نظم کی تخلیق کے وقت اس کا وقتی تاثر ان کے تخلیقی شعور پر باقی یا مسلط رہا ہو، یہ کہنا دشوار ہے۔ درحقیقت آفاقی سچائیاں اس طرح زمان و مکان کی حدود کو عبور کرتے ہوئے اپنے اظہار کے وسائل تلاش کر لیتی ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی ایک نظم ''یہ لڑائی دائمی ہے'' کو دیکھا جائے ؎

آفتاب مغرب میں کہ مشرق میں ہو
یہ لڑائی دائمی ہے
ایک جنگ لڑ کے لوٹتا ہوں میں
تو ایک اور جنگ راہ روکتی ہے
ہار کب ہوئی تھی اور جیت کب
کس جگہ شکست میں نہاں تھی فتح
کب تھی فتح میں شکست یاد کس کو؟
تیغ اور تبر اٹھائے دائروں میں دوڑنا
جانے کب تلک مرا نصیب ہے

سوچتا ہوں اپنی ساری سرحدوں کو توڑ دوں
اپنے سارے اشتہار پھاڑ دوں
اپنے سارے سلسلوں کو بھول جاؤں
ساری جنگی قوت اپنی
منتظر سمندروں میں پھینک دوں
(یہ لڑائی دائمی ہے)

اس نظم میں لفظ ''جنگ'' خود ایک Totalizing قوت کا اشاریہ معلوم ہوتا ہے۔ کائنات کے ہر موجود میں جاری و ساری زندگی اور اس کے عمل کے ہر تغیر کو اس حوالے کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پوری نظم اشاراتی صفات سے متصف ہے۔ جگہ، نام اور واقعہ کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ یہاں میراجی کا نظریہ یاد آتا ہے۔

''سچی شاعری وہی ہوتی ہے جو اشاراتی ہو۔۔۔۔۔ بات کو دھندلکے میں رکھنے سے ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ علامت خیال کی سب سے بڑھ کر آپ روپی صورت ہے۔ اشاراتی شاعری اظہار کا ایک ایسا فطری طریقہ ہے جو ہماری ہستی کی گہرائیوں سے اُمڈ کر نمودار ہوتا ہے۔''

لہجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نظم میں والہانہ پن کی کیفیت تو ہے لیکن سرخوشی کا شائبہ تک نہیں۔ علاوہ بریں اتنا سنجیدہ آفاقی مسئلہ بیان کرنے کے درمیان زیادہ تر بلند بانگی کے جو عناصر نمایاں ہو جاتے ہیں، نظم اس سے بھی پاک ہے۔ یعنی سنجیدہ مسئلے کا اشاراتی اظہار بہت سلیقہ مند سنجیدگی سے کر دیا گیا۔ ایک نظم ''غاروں سے غاروں تک'' ملاحظہ ہو ۔

میں جب غاروں سے نکلا تو میں نے سوچا
برف جمی ہے جو اشجار پہ، پگھلا دوں گا
گرد جمی ہے جو چہروں پر، صاف کر دوں گا
زہر ہوا میں جو پھیلا ہے، پی جاؤں گا
لیکن

سڑکوں، بازاروں میں
اندھا دھند گزرتی بھیڑ
اور بارش میں چلتی لاری کو چھینٹے اڑاتے جب دیکھا
سڑکوں اور خونخوار ہجوموں سے گھبرا کر
اپنی ساری سوچ سمیٹ کر
میں غاروں میں لوٹ گیا

(غاروں سے غاروں تک)

یہ نظم لفظی اعتبار سے قدر آسان ہے۔ ظاہری مفہوم بھی بہت پیچیدہ نہیں لیکن عنوان میں ہی جو مرکزی خیال نمایاں کر دیا گیا ہے چار لفظوں میں، اگر ہم پوری نظم کے آئینے میں اس کی تفہیم کرنے بیٹھیں تو ورق کے ورق سیاہ کرنا پڑیں گے۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی نظموں میں غور کرنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کی تمام تر نہیں تو بیش تر اور میرے ناقص مطالعے کی بنیاد پر اکا دکا نظموں کو علیحدہ کر دیں تو تخلیق کار کی شخصیت کا اظہار نہیں ملتا۔ سیدھے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح الیٹ کے اس نظریہ جس کا میں کلی طور پر قائل نہیں لیکن پرتپال سنگھ بیتاب کی نظمیں اس نظریہ سے نزدیک تر معلوم ہوتی ہیں لہٰذا اس کا ذکر کر دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ الیٹ کہتا ہے:

''شاعر کے ہاں شخصیت کی طرز کی کوئی شئے نہیں ہوتی، جس کا وہ اظہار کرے۔ اس کے پاس تو محض اظہار کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس وسیلۂ اظہار میں تاثرات اور تجربات عجیب وغریب اور غیر متوقع صورتوں میں یکجا ہو جاتے ہیں۔''

میرے نزدیک شاعری شخصیت کا اظہار بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی بھی ہے۔ اور میں اسے تب تک کوئی عیب نہیں سمجھتا جب تک کہ اس قسم کے خیالات نظم کی شعریات پر پورے اتریں۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے، اس سے درگزر کرتے ہوئے پرتپال سنگھ بیتاب کی نظم ''احساس جرم'' کو دیکھا جائے۔

سرسوتی کو جب میں نے
اپنے گھر میں استھاپت کیا

توسوچا تھا کہ اس کی آرادھنا کروں گا
سادھنا کروں گا
ور مانگوں گا اور پاؤں گا
لیکن مورتی کو شوکیس میں سجا کر میں
روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا
اور قریب قریب بھول ہی گیا
کہ میرے گھر میں
سرسوتی کا پرویش بھی ہے
کبھی کبھار گھر میں آیا ہوا کوئی مہمان
جب ڈرائنگ روم کی ہر چیز پر
اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہے
اور اس کی نظر
اک جگہ پر آ کر ٹھہر جاتی ہے
تو وہ چونک کر کہتا ہے
''واہ کتنی پیاری مورتی ہے
پیتل کی ہے یا تانبے کی؟''

(احساس جرم)

اس نظم میں تین باتیں غور کرنے کی ہیں۔(۱) کیا یہ علامتی نظم ہے؟ (۲) کیا یہ غیر علامتی نظم ہے؟ (۳) اگر علامتی نظم ہے تو اس کی کیا اہمیت اور قدر ہے اور اگر غیر علامتی ہے تو اس کی اہمیت اور قدر کیا ہے؟

پہلے سوال کا جواب تو یہی ہے کہ یہ نظم غیر علامتی طور پر بھی زبردست تاثر رکھتی ہے۔ مذہبی قدروں کی پامالی کا استعارہ بھی اس کے مرکزی خیال کو کہہ سکتے ہیں

دوسرے سوال پر غور کریں تو ہمیں اس نظم کے جو چھوٹے چھوٹے ضمنی واقعات ہیں اس سے بڑی مدد ملتی ہے اور یہ نظم اس آئینے میں بہت معنی خیز ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ہندو مذہب کی

روایت کے تعلق سے مورتی کو شوکیس میں استھاپت کرنے کا (لفظ استھاپت پر غور کریں) حوالہ نہیں ملتا۔ دوسرے مورتی کو شوکیس میں سجانے اور اس کی سادھنا کرنے میں دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ یہی معاملہ ڈرائنگ روم کا ہے۔ یعنی سرسوتی کی مورتی کو گھر میں استھاپت کرنے اور اس کی آرادھنا، سادھنا کے لیے شوکیس اور ڈرائنگ روم کا انتخاب جہاں کہ اکثر ظاہری سجاوٹ کی چیزیں رکھی جاتی ہیں کہ کوئی مہمان آئے تو اس پر ہماری شخصیت اور اخلاق کا اچھا اثر ہو، قطعاً نامناسب ہے۔ اس لیے کہ استھاپنا اور آرادھنا سادھنا کا تعلق عقیدت سے ہے سجاوٹ سے نہیں۔

تیسری بات یہ کہ امیر سے امیر اور مفلس سے مفلس ہندو گھروں میں اگر پوجا گھر کے عنوان سے ایک علیحدہ کمرہ نہیں تو پوجا استھل کے طور پر ایک طاق ضرور ہوتا ہے جو علیحدہ ہوتا ہے اور جس کے اوپر دوسری چیزیں نہیں رکھی جاتیں۔ سوائے پوجا سامگری کے۔ جدید دور میں (قدیم دور میں تو ڈرائنگ روم کا تصور نہ تھا، بیٹھک کا کمرہ یقیناً ہوتا تھا اور اس میں طاق پر مورتی کا رواج بھی ہوتا تھا لیکن پوجا گھر اس میں نہیں تھا) اگر ڈرائنگ روم میں مورتی استھاپت کرنے کا اہتمام کیا بھی جاتا ہے تو وہ اس طرح کہ پورا ڈرائنگ روم ایک چھوٹے سے مندر کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ دلائل کے لیے مختلف ٹیلی وژن سیریلز موجود ہیں اور جن سے متاثر ہو کر ہی شاید ڈرائنگ روم میں یہ رواج اب بڑھتا جا رہا ہے۔

تو پھر شاعر کا مذہبی قدروں کی پامالی کی ضمن میں علامتی اظہار کے لیے ان الفاظ کا استعمال چہ معنی دارد؟

یہیں سے علامتی تفہیم کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ اگر سرسوتی کو علم کی علامت تصور کر لیا جائے اس لیے بھی کہ سرسوتی کو علم کی دیوی ہی کہا جاتا ہے تو راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو جانا، مورتی کو شوکیس میں سجانا، ڈرائنگ روم میں استھاپت کرنا اور اس کی آرادھنا اور سادھنا نہ کر پانے کا احساس جرم اور اگر مورتی کو ڈرائنگ روم میں استھاپت کرنے کی غلطی کو بھی احساس جرم میں شامل کر لیا جائے تو معنوی نسبت میں ایک المیاتی عنصر کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے ڈرائنگ روم میں مورتی کو سجاوٹ کے طور پر رکھنا ہی اس روحانی محرومیت کا باعث ہو۔ تو اب تمام ظاہری مفاہیم تبدیل ہو جاتے ہیں اور مذہبی اقدار کی پامالی کی

اور اس کے پس منظر میں خالص علم کی پامالی بھی کئی دیگر وجوہات کے ساتھ بہت شدت لے کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اثر کی یہ شدت نظم کے آخری مصرعہ میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ ''پیتل اور تانبے'' کا ذکر ہمارے مردہ سماجی ذہنوں جو کہ Economical Status سے آگے غور وفکر نہیں کر سکتے، کی پول کھول دیتا ہے۔ اور اس زد میں ہم تھوڑی بہت حیثیت رکھنے والے بھی پوری طرح آجاتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مندرجہ بالا تمام نظموں میں یہ بات آگے کے زمانوں کی بھی ہو رہی ہے۔ ایک اور نظم ''میں ایسا نہیں کروں گا'' ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

میں اپنی حیات کا نوسٹراڈومس ہوں
میری خوابیدہ نظموں میں درج باتیں اکثر
کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حقائق کا لبادہ پہن کر
میرے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں
پہلے کہی ہوئی نظمیں
اپنے بھرپور تشخص کے ساتھ
وقتاً فوقتاً پیش آتی رہی ہیں
جو کچھ میں اب نظموں کی صورت میں
لکھ رہا ہوں
وہ سب بعد میں کسی نہ کسی روپ میں
ضرور سامنے آئے گا
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں
کہ یہ نظم نگاری چھوڑ دوں
کہیں ایسا نہ ہو
کہ میں کوئی ایسی نظم لکھ دوں
جو میرے لیے بہت بری ہو
اور کبھی نہ کبھی اپنی بری تجسیم لیے
میرے سامنے آکھڑی ہو

لیکن پھر میں سوچتا ہوں
اگر میں یہ سب چھوڑ بھی دوں
تو بھی جو پیشانی پہ لکھا ہے
وہ تو پیش آئے گا ہی
اس لیے میں اپنے اندر کے
نوسٹراڈومس کو قتل نہیں کروں گا

(میں ایسا نہیں کروں گا)

وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی عرض کر دیتا ہوں کہ نوسٹراڈومس کو بہت بڑا عالم نجوم کہا جاتا ہے۔اس نظم کا لفظی ومعنوی کینوس کس قدر وسیع ہے، بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کی متعدد مثالیں پرتپال سنگھ بیتابؔ کی نظموں میں موجود ہیں۔ان کی روشنی میں ان کا بیان کہ'اکیسویں صدی میں پیدا ہونے والی ان کی سوچ کے احاطے میں یہ تصور کہ پرتپال سنگھ بیتابؔ کو یہ نظمیں سو سال بعد کہنی چاہیے تھیں' صادق آتا ہے۔

نمونہ کلام

نام: پرویز احمد بٹ
قلمی نام: پرویز مانوس
پیدائش: ۶، مارچ ۱۹۶۶، سرینگر
پیشہ: مدرس
تصانیف: بیتے لمحوں کی سوغاتیں، موسم اڑان کا، چاند، لمس، گلاب (شعری مجموعے)
شکارے کی موت، مٹھی بھر چھاؤں (افسانوی مجموعے)
اعزازات: اسٹوڈنٹس کلچر کونسل، جموں یونیورسٹی، لٹریری ایوارڈ
ادبی کنج، جموں لٹریری ایوارڈ
لوک لکھاری سبھا، جالندھر، لالہ جگت نارائن لٹریری ایوارڈ
ریاستی کلچرل اکیڈمی، بیسٹ بک ایوارڈ
انجمن ترقی اردو، کشتواڑ، لریری ایوارڈ
پتہ: 115-Azad Basti Natti Pora West Srinagar-

غزل

نفرت کا اپنے دل میں کوئی ناگ پال کر
اجداد کی زمیں کو نہ یوں خوں سے لال کر

اس نفرتوں کے دور میں ہے میری التجا
رکھنا محبتوں کی وراثت سنبھال کر

کیا ہوں میں؟ کون ہوں میں؟ ہے میرا مقام کیا؟
آ مجھ سے آج پھر وہ پرانے سوال کر

کوئی مرے رفیق سے پوچھو تو یہ سوال
کیا مل گیا اسے مری پگڑی اچھال کر

دعویٰ کیا تھا جس نے محافظ کے نام کا
وہ چل دیا ہے خواہش دل کو نکال کر

آماجگاہ شر ہے یہ، دنیا نہیں ہے اب
رکھنا قدم فرشتو! یہاں دیکھ بھال کر

منسوب تیرے نام سے ہو جائے تیرا شہر
قائم تو ایسی شہر میں اپنی مثال کر

پرویز مانوس

اس میں کوئی شک نہیں کہ پرویز مانوس کے اشعار رومانی عشق و محبت اور محبوب جو کہ جیتا جاگتا وجود رکھتا ہے، کے بیانات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس میں پرویز مانوس کی شاعرانہ طبیعت کے مختلف رویوں کا دخل ہے۔ ان مختلف رویوں میں جو شعری رویے مادی ترقی کے تصور کو اپنے زمانی پس منظر میں نمایاں کرتے ہیں، وہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ پرویز مانوس کا ذاتی معاشرہ اور خطہ جس کے ملک کے دیگر علاقوں سے چند مسائل بہت مختلف ہیں، مزید کربناک ہیں۔ جہاں جہاں پرویز مانوس نے ان مسائل کا اظہار اپنی تخلیق میں کیا ہے، وہاں وہاں ان کا شعری حسن مزید نکھر کر سامنے آیا ہے۔

یہ بستی خونچکاں ہونے لگی گر روز یونہی
ہنسیں گے بیٹھ کر آدم کی لاشوں پر، پرندے

صدائیں وحشیوں کی آرہی ہیں روح سے میری
میرے اندر بھی اگ آئے گا جنگل، دیکھتے رہنا

درندے جھانکتے ہیں جب کبھی غربت کی وادی میں
وہ چھپر میں جواں بیٹی چھپانا بھول جاتا ہے

جو شعاؤں کی قبا اوڑھ کے چلتے تھے کبھی
ساتھ میں سایۂ دیوار لیے پھرتے ہیں

آج بھی راہ محبت میں ترے خوش گزراں
اپنے شانوں پہ وہی دار لیے پھرتے ہیں

پرویز مانوس اپنے عہد کی تجدید پرستی جس میں سائنسی عقلیت سے وابستگی اور اس کے

ذریعے مادی ترقی کے باوجود انسانی قدروں کے اعتبار سے جو ایک حصار قائم ہو گیا ہے، اس پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں زمانے کی بہت زیادہ توجہ فوری مسائل کی جانب ہے۔ جبکہ زیادہ توجہ معاشرے کی تہہ میں چھپے ہوئے مسائل کی جانب ہونی چاہیے۔ فوری طور پر وجود میں آنے والے مسائل کے حل کے لیے جو صورتیں اختیار کی گئی ہیں، ان میں عجلت پسندی کا جو مظاہرہ کیا گیا ہے، وہ بھی 'نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم' کے عین مطابق ہے۔ پرویز مانوس کے نزدیک معاشرتی نظام اور اس میں زندگی گزارنے کے تقاضوں میں ذات کے داخل کو بھی وہی اہمیت ملنی چاہیے جو ذات کے خارج کو حاصل ہوتی ہے۔

لٹتے ارمانوں کا مٹھی میں لیے مال و متاع
ہم جہاں پھرتے ہیں، بازار لیے پھرتے ہیں

اپنی عظمت کے لیے میرے قبیلے والے
اپنے اجداد کی دستار لیے پھرتے ہیں

لہو کی بارشوں نے زہر کی فصلیں اگائی ہیں
مگر الزام تو اس گاؤں کے دہقاں پہ آیا ہے

میں نے اپنے دل میں سب کا درد بسایا یہ سن کر!
ڈال دیے قاتل نے خنجر، سارے میری جھولی میں

تہہ خانے والوں کو جانے کیوں امید ہے اک دن یہ
وحشت کا گھنگھور اندھیرا ڈھل جائے گا نئے افق پر

پرویز مانوس کے اشعار میں معاشرے کے جذباتی تقاضوں پر سماجی تقاضوں کے ترجیح پا جانے کے خلاف شدید احتجاج ملتا ہے۔ یہ احتجاج اپنی شدت کے باوجود کہیں تو نرم الفاظ میں ظاہر ہوا ہے اور کہیں قدر تلخ۔ پرویز مانوس معاشرے میں زندگی بسر کر رہے افراد کی جبلتوں سے

بخوبی اگاہ ہیں۔اوران کی نفسیاتی پیچیدگیوں، ان کے حواس کے مطالبات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ وہ انسانی ذہن میں ذات کے داخل اور خارج کے باہم متضاد رویوں کے آئینے میں معاشرتی سچائیوں کے جبر کو تخلیقی سطح پر تسلیم نہیں کرتے اور اس کی عائد کردہ ذہنی شرطوں کی بالادستی انھیں بہت رنج پہنچاتی ہے۔اس تعلق سے منطقی اثبات پسندی کا رجحان ان کے یہاں لسانی سطح پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ برٹرینڈ رسل نے لسانی اظہار کے چار بنیادی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''سب سے پہلے یہ مسئلہ آتا ہے کہ جب ہم زبانوں کو کسی معنی کے اظہار کے ارادے سے استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں واقعتا کیا وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ نفسیات کا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خیال، لفظ، جملے اور اس حقیقت کے مابین جس کا حوالہ یا اظہار مقصود ہوتا ہے، رشتے کی کیا نوعیت ہوتی ہے، یہ مسئلہ علم الوجود سے متعلق ہے۔ تیسرا مسئلہ جملوں کو استعمال کرنے کا ہے تا کہ سچ سامنے آئے نہ کہ جھوٹ۔اس مسئلے کا تعلق اختصاصی علوم سے ہے جو زیر بحث جملوں کے مافیہہ سے ربط رکھتے ہیں۔ چوتھا مسئلہ اس سوال سے منسلک ہے کہ ایک واقعے کو (جیسے کہ ایک جملہ) دوسرے سے اس کی علامت کا اہل ہونے کے لیے کیا رشتہ قائم کرنا چاہیے۔''

(بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس از شمیم حنفی، ص ۱۵۹)

لسانی اظہار کے ان چار بنیادی مسائل کو اگر سوالات کی صورت میں دیکھا جائے تو اس کے جوابات پرویز مانوس کے اشعار میں موجود ہیں۔

بہت غرور پروں پر ہے جس پرندے کو
تم اس کے سامنے اونچی اڑان رکھ دینا

چاند کو چھونے کی ضد نے بدنام کیا
ہم نے تیرے نقش بنائے شاخوں پر

دنیا کی اک فقیر نے کچھ یوں مثال دی
مٹھی میں لے کے خاک ، ہوا میں اچھال دی

ارزاں بہت ہے آج کے انسان کا لہو
وہ کون سی جگہ ہے، جہاں یہ گرا نہ ہو

تعمیر آؤ ایسے کریں اب سماج کی
مندر میں مسجدوں میں جہاں فاصلہ نہ ہو

لشکر خوں تشنہ ہے اس شہر کے سر پر سوار
ہر قدم پر آپ کو اک نوحہ گر مل جائے گا

عقیدے کی طرح مت بانٹنا سورج کو خانوں میں
بکھر جائیں گی سب پرچھائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے

جنوں میں لے کے ڈوبی ہے تمہیں اک سیپ کی خواہش
کبھی مت ناپنا گہرائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے

اگر اک باپ نے سب بیچ کر بیٹی بیاہی تو
سسک اٹھیں گی سب شہنائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے

پرویز مانوس نے اپنے اشعار میں زمانے کی لہک اور والہانہ پن کے سطحی مضمرات کو جگہ نہیں دی ہے۔ادبی تخلیقات کے آئینے میں ان کی شخصیت کو مد نظر رکھتے ہوئے نئے زمانے کے انسان کی دشواریوں کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ایک ایسی نسل جس کے پاس ماضی کی شاندار روایت اور اپنے آبا و اجداد کی بہادری پر فخر کرنے کے تمام اسباب موجود ہوں اور پرانی

تہذیب کی اعلیٰ اقدار کے خوشگوار اثرات ان کے خون میں شامل ہوں اور پھر زمانے کی طوالت کا اندازہ کرتے ہوئے اس کے اعتبار سے دم بھر لمحوں میں اس شاندار ماضی کے منظر کا بھوک، افلاس، بے روزگاری اور محرومی میں تبدیل ہو جانا ذہنی انتشار کی اس کیفیت کو جنم دیتا ہے، جس کی تہہ اندر تہہ مایوسی اپنے پورے شباب پر ہوتی ہے۔ پرویز مانوس کے اشعار میں اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

شہر میں اندھوں کو آئینے دکھاتا کون ہے
بے در و دیوار کے یہ گھر بناتا کون ہے

اجنبی ہیں میں انھیں سمجھاؤں کیا اور کس طرح
بند دروازوں پہ آوازیں لگاتا کون ہے؟

سمجھ سکو تو یہی کہہ رہے ہیں سناٹے
ہر ایک شخص سماعت سمیٹ کر لائے

وہ جھونپڑا جو مکانوں میں رہ گیا گھر کر
ترس رہا ہے ہوا اور روشنی کے لیے

کبھی جن بستیوں میں دب چکے تھے راکھ کے شعلے
انہیں بھی فتنہ گر اک دن مذاہب کی ہوا دے گا

پرویز مانوس کی شاعری میں ایسے عناصر موجود ہیں جو انہیں الفاظ کی در و بست کے سلسلے میں ایک جذباتی نظام کے زیر سایہ تخلیق کار کی صورت میں بھی نمایاں کرتے ہیں۔ پرویز مانوس اپنے معاشرے کے محض تمدنی مسئلوں کی جانب ہی نظر نہیں کرتے۔ اس طرح تو کسی بھی شاعر کا تخلیقی منظر نامہ بنیادی تمدنی عناصر کی شمولیت کے باوجود ادھورا معلوم ہوگا۔ انھوں نے اپنے معاشرے اور داخلی تجربات کے حوالے سے ذات اور کائنات کا مشاہدہ تو کیا ہے لیکن اسے کسی

طے شدہ فارمولے یا ہدایت کا آلہ کار نہیں بنایا ہے۔ ان کی نظر زندگی کے فنی اور فکری معیاروں کی تبدیلیوں پر بھی ہے۔ اس طرح ان کی ذات کا آشوب اور ان کے عہد کا آشوب مل کر تخلیقی سطح پر ایک ایسی تیسری صورت ابھارتے ہیں جو سامنے کی الجھنوں اور پیچیدگیوں سے آگے بڑھتے ہوئے زمانی معلوم ہوتی ہیں۔

مندروں ، مسجدوں میں ٹکراؤ
دیکھ کر ٹوٹ جائے گا پتھر

آسمانوں سے اترتی آندھیوں! یہ سوچ لو
کیا اڑا لے جاؤ گی، اب کیا ہمارے پاس ہے

رام کو تو آج بھی سونے میں تولے ہے سماج
اور سیتا کا مقدر آج بھی بن باس ہے

کھلا صیاد نے رکھا ہے پنجرا آج کے دن بھی
نہ جانے پھر بھی کیوں پنچھی رہا ہونے سے ڈرتا ہے

پرویز مانوس اپنے معاشرے میں تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے عصر حاضر کے مفید امکانات سے ہم آہنگ کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ سکون وضبط اور معروضیت جس سے ان کے معاشرے کا جدید دور محروم ہے اور اس بنیاد پر انھیں نئے زمانے کا معاشیاتی اور اقداری آئینہ احساس شکست سے دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ نئے زمانے میں وہ سکت نہیں ہے کہ وہ نشیب وفراز کی اذیتوں کی راہوں کو ہموار کرتے ہوئے زندگی کی اس منزل پر پہنچ جائے جہاں سے زندگی کے پیمانے ایک کل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جہاں رنج وغم کی دیواریں ہیں تو ان کو بھیدنے کے لیے نشاط کا آلہ کار بھی موجود ہے۔ جہاں انسان کی ذہنی گرفت کائنات کی دوسری وسعتوں کو بھی قابو میں لے لیتی ہے۔ پرویز مانوس کے معاشرے میں کائنات کی وسعتوں کی یہ پرچھائیاں منتشر صورتوں میں دھندلکوں میں قید ہیں۔ اس لیے تہذیب واقدار

کے چہرے مختلف پردوں میں ہیں۔

سمٹ جاتے ہیں بس اک چاپ سن کر ہی مکیں اپنے
کوئی معصوم بچہ بھی یہاں رونے سے ڈرتا ہے

سمجھ کر دھند جس کو آپ نے منظر سجائے ہیں
یقینا وہ کسی مظلوم کے گھر کا دھواں ہوگا

توڑ کر میں اس قفس کو جب رہا ہوں جاؤں گا
پھر کسی مظلوم و بے کس کی صدا ہو جاؤں گا

پرویز مانوس کے اب تک کے ادبی سفر اور تخلیقی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہان اردو میں ان کا مستقبل روشن ہے۔

نمونہ کلام

نام: محمد پرویز

قلمی نام: پرویز ملک

پیدائش: ۱۰، ستمبر ۱۹۶۴ء

ولدیت: کرامت اللہ

تعلیم: ایم۔اے۔(اردو)

پیشہ: مدرس

مشغلہ: شاعری، نغمہ سازی، ڈائرکٹر، ڈرامہ نگار

تصنیف: خیالوں کے رنگ (غیر مطبوعہ)

انعامات: بسٹ ڈائرکشن ایوارڈ

بسٹ اسکرپٹ رائٹرایوارڈ

پتہ: R/O Darhal ,Teh- Darhal:

Dist. Rajouri-185135

موبائل: 9906087350

غزل

الجھی الجھی نظر کس لئے
کچھ ادھر، کچھ ادھر کس لئے

رات کاٹی ہے پیڑوں تلے
راہ میں تیرا گھر کس لئے

ہو چمن کی مجھے آرزو
آپ کو دیکھ کر کس لئے

کتنے خوابوں کی قاتل ہے یہ
پارسا ہے سحر کس لئے

بات پرویز بڑھ جائے گی
دیکھتے ہو ادھر کس لئے

پرویز ملک

پرویز ملک کے اشعار لفظی اور معنوی سطح پر اپنا ایک مختلف نظام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مادی ترقیاں یا عقل کی فتوحات ہر انسانی مسئلے کا حل نہیں ہیں۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے جتنے بھی انقلاب دنیا میں برپا ہوئے یا برپا کیے گئے تاریخ نے جب ان کا جائزہ لیا ہے تو بیش تر کے انسان کش پہلوؤں کی ہیبت ناک تصویر مرتب ہوئی ہے۔ اس طرح گویا کوئی انقلاب بڑا ہو یا چھوٹا، ملکی سطح پر ہو یا مقامی سطح پر، بیش تر نے اتنے مسائل حل نہیں کیے جتنے کہ نئے مسائل پیدا کیے۔ پرویز ملک کے چند اشعار دیکھے جائیں ؎

اسی زمین پہ ٹھہروں یا آسماں ڈھونڈوں
سکون دل ہے کو پھر، کون سا جہاں ڈھونڈوں

دیار دل میں تو ہوگا کہیں وجود میرا
آ تری آنکھ کے شیشوں میں عکس جاں ڈھونڈوں

سجاتے آئے ہیں ہر رات بزم آرزو برسوں
جلایا ہے چراغ دل میں سینے کا لہو برسوں

بستی کی مانگ میں کوئی راتیں سجا گیا
اک لا دوا مریض سحر ڈھونڈتا رہا

جشن ماتم منا لیا اس نے
زہر ہم نے ابھی پیا ہی نہیں

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ پرویز ملک کے یہاں مایوسی اور حرماں نصیبی کی آواز

زندگی کی دوسری آوازوں پر غالب ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ مادی کمالات کی ہوس نے روحانی زوال کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باعث انسانی رشتوں کے احساس کی یا تو نوعتیں بدل دی ہیں یا انہیں ختم کرنے کی حد تک لا کھڑا کیا ہے۔ ہمارے یہاں چونکہ مادی عملی دشواریاں زیادہ ہیں اور روحانی صداقتوں کا ایک مستحکم اور لمبا سلسلہ بھی رہا ہے۔ تو اس وجہ سے بھی روحانی اور جذباتی تقاضوں پر اتنی توجہ نہ کی گئی۔ یہاں ''گھر کی مرغی دال برابر'' والی مثل اندر ہی اندر کام کرتی رہی۔ اور نتیجہ جیسا کہ پرویز ملک کے اشعار سے ظاہر ہے ؎

بھٹکتی آرزو کو جستجو سے روکنا ہوگا
مجھے معلوم ہے، اس در سے خالی لوٹنا ہوگا

بچانی رسم دنیا ہے، نبھانی ہے محبت بھی
یہ وہ نقطہ ہے اے دل جس پہ کافی سوچنا ہوگا

منازل سرنگوں ہیں اس کے آگے
مسافر نے مسافت خوب کی ہے

کبھی مانگوں دعا، مل جائے عمر جاوداں مجھ کو
کبھی لمحوں میں مرجانے کی خواہش جاگ جاتی
ہے

چاند تاروں کی بستیاں مانگے
وہ خلاؤں کی وادیاں مانگے

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے پرویز ملک کے شعری اسلوب کا کافی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شعری اسلوب کے آئینے میں کافی حد تک شاعر کی شعری شخصیت اور اس کے شعری مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اسلوبیات کے حوالے سے

بہت عمدہ بات کہی ہے:

''اسلوبیاتی تجزیے سے مصنف کی پہچان اس طرح ممکن ہے جس طرح انسان اپنے ہاتھ کی لکیروں سے پہچانا جاتا ہے۔ اسلوبیات کے ذریعہ مصنف کے لسانی اظہار کے ہاتھ کی لکیروں کا پتا چلایا جاسکتا ہے اور اس کی شناخت حتمی طور پر متعین کی جاسکتی ہے۔ اشخاص کی طرح اصناف کا بھی مزاج ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلوبیات کی مدد سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ باہم دیگر مختلف اصناف کا اسلوبیاتی امتیاز کیا ہے۔''

(بحوالہ معاصر تنقیدی رویے، از ابوالکلام قاسمی، ص ۱۴۸)

پرویز ملک کے دو شعر اس ضمن میں پیش کرنا خالی از دلچسپ نہ ہوگا ۔

آج دیکھا ہے اسے کچھ دیر نظریں باندھ کر
آج پہلی بار اپنے حوصلے اچھے لگے

دوستی پرویز کیا جب ہیں دلوں میں رنجشیں
ہاں مگر یہ کوششوں کے سلسلے اچھے لگے

پہلے شعر میں پرویز ملک کے شعری خیال کے اظہار کے لیے مختلف راہ اختیار کرنے کا ثبوت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ دوسرا شعر ناصر کاظمی کے اس بے حد معیاری اور مقبول شعر کی یاد دلاتا ہے۔

وہ دوستی تو خیر اب نصیب دشمناں ہوئیں
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

پرویز ملک کا احساس اور فکر بڑے شعرا کے ذہن میں ابھرنے والی فکر کا تعاقب کرتی ہے۔ یہ خصوصیت انکے ہم عصروں میں ان کے مقام کا تعین کرتے ہیں

نمونہ کلام

نام: سرفراز حسین خان
قلمی نام: تحسین جعفری
پیدائش: ۲، جون ۱۹۰۸ء بمقام
منگناڑ، پونچھ
ولدیت: محمد خان
تعلیم: میٹرک
پیشہ: رٹائرڈ ایڈیٹر ہفت
روزہ "کشمیر" (اب پاک مقبوضہ کشمیر)
تصانیف: سرمایۂ نجات، بہتر
پیاسے، مسک شبیرؓ واقبال، سچی
کہانیاں، معاون ریاضی،
ذریعہ اظہار:
اردو، پنجابی، سرائیکی، کشمیری، گوجری

غزل

عارض سیمیں پہ خم زلف رسا ہونے تو دے
جس پہ سب مرتے ہیں، پیدا وہ ادا ہونے تو
دے

دل کے آئینے میں آئے گی نظر سب کائنات
پاکبازی کی ذرا اس پر جلا ہونے تو دے

راز ہستی تجھ پہ ہو جائے گا خود ہی آشکار
نور حق سے خانۂ دل کی ضیاء ہونے تو دے

کلفتیں مٹ جائیں گی سب، دور ہوگا رنج وغم
اپنے قلب زار کو درد آشنا ہونے تو دے

ضوفشاں شمع امامت ہوگا تحسیں صبح دم
ظلمت شب کو ذرا سیماب پا ہونے تو دے

تحسین جعفری

تحسین جعفری کے کلام میں ایک طرف جہاں عشق کی وارداتیں گفتگو کا موضوع بنی ہیں، وہیں انہوں نے اس دور کے سائنسی ڈھانچے جس کے اندر سختی اور لوچ نہ ہونے کے سبب انسان کے اندرونی مسائل کے حل کی گنجائش نہ کے برابر تھی، پر بھی سخت اعتراض ملتا ہے۔آج کے دور کی بات دوسری ہے کہ مختلف سائنس دانوں نے اگر مقدس کتابوں میں موجود وہ حقائق جہاں کے سائنس کی اب رسائی ہو رہی ہے، پر پورا اعتماد قائم نہیں کیا ہے تو اسے رد بھی کرنے کی جسارت اب ان میں باقی نہیں ہے۔تحسین جعفری کے زمانے تک نئے دور کا معنی و مطلب محض ظاہر داری اور مشرقی تہذیب پر مغرب کو غالب کرنے کی جو منصوبہ بند مہم تھی، اس کی جانب ان کی شاعری میں کھل کر اظہار ملتا ہے۔

ایک غزل کے تین اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

اٹھایا پردہ ٔ شرم و حیا فیشن پرستی نے
مٹایا نقشہ ٔ صدق و صفا فیشن پرستی نے

نہ پاس قوم ہے باقی ،نہ عزت باپ دادا کی
عجب مدہوش ہم کو کر دیا فیشن پرستی نے

لگے تہذیب کہنے ،ہر طرح کی بے حیائی کو
ذلیل اب کہ ہمیں تحسیں کیا فیشن پرستی نے

ظاہر ہے کہ اشعار میں شامل باپ دادا کی قدروں کا تصور وسیع پیمانے پر زندگی اور روح اور اس کے اندرون سے بھی جا ملتا ہے، جبکہ انیسویں صدی کا عام ذہن بشمول عام جدید ذہن بھی مادی دنیا کی چکا چوند پر ہی توجہ کرتا تھا۔تہذیبی اور ثقافتی عمل کی جگہ مشینی عمل کا غلبہ تھا جس میں

ذریعۂ معاش اور عیش پرست زندگی کے لئے ہی کھرے کھوٹے، دین و مذہبی نقطۂ ہائے نظریات کو نظر انداز کر ایک طبعی کیمیائی ارتقا ہی زندگی کا اصل مقصود تھا۔ گویا انسان اب بیرونی عکس کو قبول کرنے کے لئے اس قدر مجبور تھا کہ آپ اپنی شخصیت اور قدروں سے بے نیاز ہونے کی جدوجہد بھی عبث معلوم ہوتی تھی۔ تحسین جعفری کے دور میں چونکہ عام سطح پر یہ عمل آج کے دور کی بہ نسبت نیا تھا اور بہت تیزی سے متوجہ کر رہا تھا، اس لئے اس دور کے مشرقی تہذیب پسند سنجیدہ ذہنوں کو آنے والے دنوں میں بدلنے والے حالات مزید خوف زدہ کر رہے تھے، جن پر احتجاج ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔

نام: حسام الدین
تخلص: بیتاب
پیدائش: ۱۹۳۲ء سموٹ، سرنکوٹ، پونچھ
تعلیم: انٹر، ادیب ماہر، کامل (علی گڑھ)
پیشہ: رٹائرڈ مدرس
تصانیف: دشت جنوں (شعری مجموعہ)
نقش راہ (اردو نثر کی کتاب)
جنبش طور (مجموعہ نظم وغزل)
اعزاز: جے اینڈ کے بیسٹ ٹیچر ایوارڈ
پتہ: Main Bazar, Surankote-185121(Dist.Poonch)
موبائل: 9697207845

نمونۂ کلام

غزل

اپنوں پہ کرو تم جور و ستم اور نگہ کرم بیگانوں پر
یہ ظلم نہیں تو اور ہے کیا، ہم شیشۂ دل دیوانوں پر

اے شمع ستم، اے شمع وفا، پر سوز تمازت سے تیری
احساس تمہیں ہوگا بھی کبھی، کیا بیتی ہے فرزانوں پر

عرفان انہیں کو حاصل ہے، توحید کی مئے جو پیتے ہیں
ہے عشق ہمیشہ فرض رہا، المست طبع دیوانوں پر

اس دور ہلاہل میں اکثر غاصب کے وارے نیارے ہیں
یہ دور ہے کیا، اس دور میں اب ہے ظلم و ستم ایمانوں پر

ہو طور مبارک موسیٰ کو، وہ حضرت تھے، ہم آدم ہیں
ہے کرم خدا کا یہ ہم پر، ہم پلتے ہیں احسانوں پر

اے ابر کرم بیتاب نہ ہو، بیتاب کو ہے احساس کرم
تو دشت و دمن گلزار کرے، تو برسے ہے باغانوں

حسام الدین بیتاب

حسام الدین بیتاب نے نظم اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور دونوں میں ان کے جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ان کے جذبات کی ترجمانی نظموں میں عمدہ طریقے سے ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان نظموں میں وہ عنوان کے اعتبار سے اپنی سرزمین، اپنے ماحول اور اس سے آگے پورے سماج اور دنیا کے بعض واقعات، حادثات اور مسائل سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ان کے اسباب بیان کرتے ہیں اور بعض اوقات ان کے حل کی جانب بھی توجہ دلاتے ہیں۔ اس مضمون میں ان کی نظموں سے متعلق ہی اظہار خیال مقصود ہے۔ غزلوں پر گفتگو کسی اور وقت۔

حسام الدین بیتاب نے اپنی نظمیں مرصع ہیئت میں کہی ہیں۔ اس لیے ردیف وقافیے کا اہتمام غزل کے آہنگ سے جاملتا ہے۔ نظموں کے اشعار درج ذیل ہیں ؎

ہوا غم میں مبتلا تو یوں بھلا کے اپنا ماضی
کبھی راہ اپنی بھولا، کبھی ہار بیٹھا بازی
تیرے ساتھ چلتا لیکن تو بٹا ہے مسلکوں
میں
تیرے پاس آ گیا تھا، تجھے جان کر نماز میں (اے مسلماں)

سامری کی ساحری کے سامنے تو سجدہ ریز
آستاں ہے اور تیرا، میرا سجدہ اور ہے
خوف و دہشت دم قدم سے ترے، دنیا میں
عیاں
میں ندائے آدمیت، میری دنیا اور ہے
غور کر مجھ میں تو اے پروردۂ اہل ستم
تیرا معنیٰ دوسرا ہے اور تو نے سمجھا اور ہے (اے پروردۂ اہل ستم!)

حسام الدین بیتاب نے اپنی ایک نظم میں اپنے شہر پونچھ کی خوبصورتی کا نقشہ بہت عمدہ طریقے سے کھینچا ہے۔اس میں انہوں نے جہاں پونچھ کی ادبی روایت کا ذکر کیا ہے وہیں اس کی تاریخی اہمیت کو بھی از سر نو اہل ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔ از سر نو اس لیے کہ ان ۳۰، ۳۵ر سالوں میں جموں وکشمیر کے جو حالات رہے ہیں ان کے سبب ایک طرح سے یہ علاقہ اور اس کی خوبصورتی پوری دنیا کے لیے انجان ہوگئی تھی۔اس نظم سے کچھ تجسس کن باتیں بھی سامنے آتی ہیں جن سے اب تک عام طور پر اہل ادب تو کیا جموں وکشمیر کی سیر وسیاحت کی آرزو رکھنے والے اور متعدد بار سیر وسیاحت کر چکے حضرات بھی میرے خیال میں انجان ہی ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ دنیا بھر میں اپنی خوبصورتی کی مثال آپ رکھنے والے گلمرگ کی کوئی نظیر کم از کم میرے خیال میں اب تک نہیں تھی لیکن شاعر کا یہ دعویٰ کہ گرجن کی وادی گلمرگ سے بھی بڑھ کر ہے، خالی از دلچسپ نہیں۔اسی طرح ریاست پونچھ کے کئی مقامات کا تذکرہ تجسس بڑھا دینے کے لیے کافی ہے۔اسی طرح انہوں نے تقسیم ہند کا بیان جس کا کہ غالباً سب سے زیادہ خمیازہ اسی ریاست پونچھ کو بھگتنا پڑا کہ اس کے بھی دو ٹکڑے ہوگئے اور اس کے بعد سے آج تک یہ علاقہ سرحدی ہونے کے سبب ادھر ادھر کی فوجی سرگرمیوں اور ادھر ادھر کے حملوں کی وجہ سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے علاقوں میں سے ہے۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ وادی کی صدا میں بھی کھینچا گیا ہے۔

بڑھ کے ہے گلمرگ سے بھی میری گرجن دیکھ لے
تحفہ ہے قدرت کا میرے حق میں ساون دیکھ لے
دیکھ نندن سر، کٹورا سر اور اس کے آس پاس
ٹھنڈے چشمے اور ہر سو مہکے گلشن دیکھ لے
پھر بھی پانی کی یہاں قلت ہے دامن گیر دیکھ
پونچھ کی پیر زمیں کشمیر کی ہمشیر دیکھ

(تصویر پونچھ)

ہے جدا بھائی ادھر، ہمشیر ہے روتی ادھر
غمکدہ ہر انجمن، اس پار بھی اس پار بھی
'پھولن' اور 'مختار مائی' نے کیا یہ راز فاش

بے ردا، بے پیرہن، اس پار بھی اس پار بھی
(اس پار بھی، اس پار بھی)

نئے فلسفے تم مجھے مت سکھاؤ
میں اپنے ہی شام وسحر ڈھونڈتی ہوں
مجھے اپنے 'بڈ شاہ' کا ہے درس کافی
نظارۂ 'شق القمر' ڈھونڈتی ہوں
میں 'ہوا' و 'سیتا' و 'مریم' کی بستی
ردادست 'خیر البشر' ڈھونڈتی ہوں (وادی کی صدا)

حسام الدین بیتاب نے اپنی سرزمین جموں وکشمیر کے دوسرے حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ ان خوں ریز کہانیوں کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی ہے جو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے امن کے طلب گاروں کے لیے بے چینی کا باعث ہیں۔ ظلم کہیں بھی ہو، بہر حال ظلم ہے اور ظالم جتنا بھی جھوٹ کا طلسم اپنے اردگرد گڑھ لے، وہ ہر حال ظالم ہے۔ حقیقت کی تیز آنکھ ہر پل اس کا تعاقب کرتی رہتی ہے اور اس کا طلسمی پردہ فاش کردیتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے شہر کی موجودہ صورت حال کو بھی انہوں نے اپنی ایک نظم میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ تمام بیانات ان کے ایک حساس شاعر ہونے کے دلائل فراہم کرتے ہیں۔

دیکھ بربریت یہ شیطان بھی
منہ چھپا بیٹھا تھا ان حالات میں
ہاتھ کے بندھے سبھی مظلوم تھے
کیا گناہ ان کا تھا، جو معصوم تھے
ان میں حوا و سیتا و مریم بھی تھی
آبر و جن کی تھی ریزہ ریزہ ہوئی (قتل عام کا منظر)

یاں سب حاکم بن بیٹھے ہیں ان میں کوئی محکوم نہیں
کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا، کسی کو کچھ معلوم نہیں
سب محروم ہیں حق سے لیکن حق سے کوئی محروم نہیں

ہر کوئی مظلوم ہے لیکن کوئی یہاں مظلوم نہیں
خود غرضی میں گم ہوکر یہ اپنا آپ گئے ہیں بھول
میرے شہر میں رہنا ہے تو ایسا منظر کرو قبول
(میرے شہر کا منظرنامہ)

حسام الدین بیتاب آج بھی اپنے نوک قلم سے کشت ادب کی آبیاری میں سرگرم عمل ہیں۔سورن کوٹ کی ادبی فضا کو برقرار رکھنے اور اسے اعلیٰ معیار عطا کرنے میں ان کی شخصیت بہت اہمیت رکھتی ہے۔امید ہے کہ آئندہ بھی ان کے قلم سے معیاری تخلیقات نمو پائیں گی۔

نمونہ کلام

نام: شیخ خالد محمود
قلمی نام: شیخ خالد کرار
ولدیت: الحاج شیخ قمرالدین
پیدائش: ۱۹، دسمبر ۱۹۷۶ء
سموٹ، سرنکوٹ، پونچھ
تعلیم: بی۔اے۔(آنرز)
پیشہ: کرافٹ ڈیزائننگ، صحافت
تصانیف: آنگن آنگن پتجھڑ (افسانوی مجموعہ)
سوا نیزے پہ سورج (شعری مجموعہ)
ورود (شعری مجموعہ)
Crescendo (اردو نظموں کا ترجمہ)
کارزباں دراز ہے (فکاہیہ مضامین)
پتہ: 59/A Tawi Vihar Colony
Sidhra Jammu-180019
NCC Computers Haji Qamruddin Building Iqbal Nagar Surankote-185121 (Poonch)
موبائل: 9419174267

غزل

کسی کے خواب کو احساس سے باندھا ہوا ہے
بہت پختہ، بہت ہی پاس سے باندھا ہوا ہے

ہمارے تخت کو مشروط کر رکھا ہے اس نے
ہمارے تاج کو بنباس سے باندھا ہوا ہے

سیاہی عمر بھر میرے تعاقب میں رہے گی
کہ میں نے جسم کو قرطاس سے باندھا ہوا ہے

مرے اثبات کی چابی کو اپنے پاس رکھ کر
مرے انکار کو احساس سے باندھا ہوا ہے

ہمارے بعد ان آبادیوں کی خیر کیجو
سمندر ہم نے اپنی پیاس سے باندھا ہوا ہے

سجا رکھی ہے اس نے اپنی خاطر ایک مسند
مرے آفاق کو انفاس سے باندھا ہوا ہے

میں اس کو سر اٹھا کہ دیکھنا تو چاہتا ہوں
مگر کندھوں کو اس نے بار سے باندھا ہوا ہے

مجھے ہر گام ہے تازہ ہزیمت عمر بھر کی
کہ میں نے آئینہ کردار سے باندھا ہوا ہے

عجب پہرے مرے افکار پر رکھے ہیں خالد
عجب کھٹکا مرے احساس سے باندھا ہوا ہے

خالد کرار

شیخ خالد کرار ہمارے دور کے ایک ایسے معتبر نو جوان شاعر ہیں جنھوں نے اپنے منفرد اور پیچیدہ محسوسات کے تخلیقی اظہار کے لیے براہ راست پیرائے بیان کے بجائے بالواسطہ پیرائے کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن مکمل طور پر براہ راست پیرائے کو ترک نہیں کیا، بلکہ خال خال ان کے اشعار میں یہ اظہار بھی نظر آ جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ پیچیدہ بیانی بالخصوص علامتی اظہار میں معنی و مفہوم کی کوئی لازمی حد فاصل مقرر نہیں کی جاسکتی اور ان کا اطلاق معنی کی کئی جہتوں پر ہوتا ہے۔ خالد کرار کے چند اشعار دیکھئے

ایک کار ہنر تماشا ہے
ایک یہ رہگذر تماشا ہے

ایک نقطے پہ مرتکز دونوں
دل مداری ہے، سر تماشا ہے

ہماری ذات مسلسل سفر میں ہے اب بھی
ہمارا خود سے کوئی رابطہ نہیں ٹکتا

خالد کرار کے مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے کہ ان کا زیادہ تر مکالمہ اپنی ذات سے ہے اور ذات کے ساتھ ساتھ جب انھوں کائنات کی وسعتوں پر غور کیا ہے تو اپنے منطقی دلائل اور مجرد فکر کے تعلق سے باضابطہ مواد بھی فراہم کیا ہے۔ لیکن یہ مواد حقیقی فلسفے کی صورت میں نہیں بلکہ حقیقی فلسفے کی جستجو میں سرگرم ان فلسفیانہ آمیز اظہار میں پوشیدہ ہے، جو ان کے شعری اظہار کا خاص وصف ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام ان کے تخیل کا عطا کردہ ہے۔ تخیل کی تعریف کرتے ہوئے مولانا حالی نے لکھا ہے:

''وہ (تخیل) ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ ہے، جو تجربہ یا مشاہدے کے ذریعہ سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے۔ یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتا ہے

اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتا ہے، جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔''

(مقدمہ شعروشاعری، ۔حالی ۔نور رضوی اینڈ کمپنی، حیدرآباد دکن، ص ۴۵)

خالد کرار کے چند اشعار ؎

اک جنس زدہ نسل ہے تہذیب کے پیچھے
بازار ہے اک کوچہ و بازار سے آگے

ہم لوگ کہ منزل کے بھلاوے کے گرفتار
آثار سے پیچھے، کبھی آثار سے آگے

میں اس کے نام کی پیچیدگی سے نکلوں گا
وہ اپنی ذات کے عرفان سے گذارے گا

خالد کرار کے تخلیقی عمل میں الفاظ کے علامتی عمل جس طرح داخل ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فطرت اور خودکاریعنی غیر شعوری عمل کا بھی خاصہ حصہ ہے۔ان کے استعمال کردہ الفاظ ایک مخصوص تصور کی نمائندگی تو کرتے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی معنی کی کسی نہ کسی جہت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انھوں نے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے، ان کی علامتی معنویت تو ہے ہی، ان کا منطقی ربط اس قدر مستحکم ہے کہ محض ایک واقعے کے بیان پر یہ سلسلہ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ذہن کو کسی نہ کسی سماجی صورت حال کی جانب بھی منتقل کرتا ہے۔

ہمارے سارے اجالے ہیں مستعار ترے
یا آپ جلنا یا کاغذ اجالنا تھا کبھی

پھر اس کے بعد سارے صحیفے نمائشی
پھر اس کے بعد آج بھی قول و قرار ریت

ہر عکس ہے خلا سبھی چہرے دھواں دھواں

ہے خواب آئینہ، مرے نقش و نگار ریت

شعور آگہی کے فلسفے میں جلتا ہوں
میں اپنے ساتھ اسی رابطے میں جلتا ہوں

یہ رات جیت کے ہر روز ہار جاتی ہے
میں روز یونہی شفق آئینے میں جلتا ہوں

خالد کرار اپنے علوم وافکار کے تخلیقی عمل کو بہت بڑے کینوس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں ان کے اردگرد کے ماحول کا بڑا دخل ہے۔ خالد کرار کے نزدیک ان کا خطہ ایک ایسے سیاسی اور اقتصادی حالات سے دوچار ہے جو جغرافیائی اور تہذیبی فضا کے اعتبار سے شدید انتشار کا شکار ہے۔ دراصل ملک کے ایک کونے میں واقع ہونے کے سبب جہاں کہ آمدورفت کے ذرائع بھی محدود ہیں، وہاں سے ملک کے دوسرے حصوں کی تہذیب اور جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے ترکیبی عناصر کے فرق و فاصلے کا بیان کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ اس فاصلے کے احساس اور خطے کے حالات نے ایک شدید جذباتی اضطراب کو راہ دی۔ خالد کرار نے ایک طرح سے اسی جذباتی اضطراب کو تخلیقی سطح پر قبول کرتے ہوئے وجودی اور اجتماعی دونوں اسلوب کے اظہار کی سمتوں میں برتا ہے۔

اندر اندر آگ دھواں
جسم کے باہر، سب پانی

کہا تھا کس نے کہ کتبے پڑھو مزاروں کے
تمہارا کام تو قبریں شمار کرنا تھا

تمام رات سراب سفر کا دھڑکا تھا
تمام رات تھی اک ہاؤ ہو کی ویرانی

خودکشی کرنے کی ہمت بھی جٹا پانا نہیں
ڈوبنے جانا تو تنکوں کے سہارے دیکھنا

ہے بدن میں جو سر گرانی سی
دیکھیئے تو لہو تماشا ہے

خالد کرار نے اپنی تخلیقات کو ماورائی دھندلکوں سے محفوظ کرنے کے لیے زندگی کے محسوسات وواردات کو سمونے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے عناصر بھی شامل کردئے ہیں جو مختلف ذائقہ اور نوعیت کے اعتبار سے خاص کر اس خطے کے لیے ضروری نئے سماجی اور ادبی تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ دراصل صوبہ جموں و کشمیر میں جو نئی سماجی اور ادبی تبدیلیوں کی ضرورت تھی، اسے خالد کرار کے بزرگ معاصرین میں سے چند ایک کے علاوہ کسی نے قبول نہیں کیا۔ اس وجہ سے بھی یہاں کے زیادہ تر بزرگ معاصرین کی شاعری پرانی معلوم ہوتی ہے۔ خالد کرار کے موضوعات میں آرزومندی اور جذباتی وفور نئے دور کی کیفیتوں کو لیے ہوئے ہے۔ رومانی شباہت اور رومانی آرزومندی کے عناصر کا اوست ان کی شاعری میں تقریباً ۵۰:۱ کا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ خالد کرار کے اشعار زمانے کے نئے تقاضوں کی لہک اور والہانہ پن لیے ہوئے ہیں۔ لیکن ان نئے تقاضوں کے اظہار کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ادبی اور سماجی کمتری کو احساس برتری میں بدلنے کے خواہش مند ہیں۔ اس طرح تو شاعر نیوراشیٹ (Neurosis) کا شکار ہو جاتا ہے۔ خالد کرار جیسا حساس شاعر بحیثیت انسان اور بحیثیت ادیب دوہری زندگی جینے پر مجبور ہوتا ہے اور اس کے لیے اسے بہت سے نشیب و فراز سے گذرنا پڑتا ہے۔ بقول ینگ:

> ''ہر خالق کی دوہری شخصیت ہوتی ہے یا دو متضاد اہلیتوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ ایک انسان ہوتا ہے جس کی اپنی ذاتی زندگی ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ ایک غیر ذاتی (Impersonal) خالق ہوتا ہے۔ بحیثیت انسان کے وہ ایک معقول یا غیر معقول انسان ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ہم اسے بحیثیت فنکار کے صرف اس کی تخلیقات کا مطالعہ کر کے ہی جان سکتے ہیں۔ بحیثیت انسان کے اس کا ذاتی مزاج،

مقصد یا خواہش ہو سکتی ہے، لیکن فنکار کی حیثیت سے وہ صرف ایک آدمی ہے۔ زیادہ وسیع معنوں میں ''مجموعی انسان'' ہے جو کہ لاشعور اور انسان کی نفسی زندگی کو شکل دیتا ہے۔ اس مشکل کام کو سرانجام دیتے وقت اسے اپنی ذاتی خوشی اور دوسری تمام چیزوں کو جو اسے زندہ رہنے کے قابل بناتی ہیں، سب قربان کرنی پڑتی ہیں۔''

(The Modern Man in Search of Soul by ung Page 195)

خالد کرار کے چند اشعار

بلا کی پیاس تھی حد نظر میں پانی تھا
کہ صحرا آنکھ میں تھا اور گھر میں پانی تھا

میری گٹھری تو اب بھی خالی ہے
مجھ پہ اپنا ہی بار ہے شاید

ضرور مجھ سے زیادہ ہے اس میں کچھ خالد
میرا حریف اگر فتحیاب ہونے لگا

ایک آذر کو قلق ہے کہ صنم خانوں میں
بت بدلتے نہیں، ایمان بدل جاتے ہیں

ٹوٹی ہوئی چھاگل میں مری پیاس پڑی تھی
میں سمجھا خزانے مرے سامان میں آئے

مکان چھوڑ دئے ہم نے لامکاں کے لیے

زمین ختم ہوئی تو یہ لامکاں بھی نہ تھا

خالد کرار کی عمر اس وقت ۴۰۔۴۵ کے درمیان ہے۔ان کی تخلیقی کاوشیں ابھی جاری ہیں۔اس عمر میں آگہی کے یہ مرحلے جوان کے تخلیقی ذہن کے خاص اوصاف ہیں، انھیں ہمہ وقت منتشر رکھتے ہیں اور بقول شاعر ؎ ''آگہی اک عذاب ہے یارب''
میں تو یہی دعا کرتا ہوں کہ ان کے تخلیقی ذہن میں آگہی کا عذاب برقرار رہے تا کہ ان کے قلم کا اضطراب انھیں تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رکھے۔

''اور منزل تو مسافر کے لیے رہتی ہے
اور رستہ کہ مری اور چلا آتا ہے''
(خالد کرار)

نمونہ کلام (نظم)

نام: خوشدیو مینی (کے۔ڈی۔ مینی)

ولدیت: شری دیوندر مینی

تعلیم: ایم۔ایس۔سی

تصانیف: ۲۱ کتابیں اردو، انگریزی، پہاڑی اور پنجابی میں ہیں جن میں تاریخ پونچھ، تاریخ راجوری اور تاریخ شاہدرہ شریف قابل ذکر ہیں

اعزاز: کلچرل اکیڈمی ایوارڈ

اسٹیٹ ایوارڈ

آکاش وانی ایوارڈ

پتہ: Azad Mohalla Near District Industry Office Poonch

موبائل: 8493881999

ٹیلیفون نمبر: 01965-220561

الہام

اس نے کہا تھا
کہ جس روز بھی
پاپ کلش بھر جائے گا
میں ضرور آؤں گا
مدتیں ہو گئیں
ہم نے چاہا بہت
اور پکارا بہت
مندروں، مسجدوں
گوردواروں
میں ڈھونڈا بہت
وہ نہ آیا مگر
اب تو بس
ایک ہی راستہ ہے یہاں
اؤمل کے سبھی
پاپ کے کلش کو
جلد بھرنے کی کوشش کریں
اور پھر جس گھڑی
پاپ کا کلش بھر جائے گا
اس کا وعدہ ہے کہ
وہ ضرور آئے گا

کے۔ڈی۔مینی

کے۔ڈی۔مینی نے اپنی شاعری میں جو تجربات پیش کیے ہیں وہ ایک مخصوص صورت حال کا محاسبہ کرتی ہے۔اس طرح وہ کچھ مخصوص اقدار جو کہ تمثیلی شکل میں ہیں ان کا انکشاف کرتی ہے۔جیسے کہ یہ شعر ؎

جب اڑانوں کے موسم گزر جائیں گے
پھر یہ غافل پرندے کدھر جائیں گے

اس طرح معنی کا بصری اور صوتی پیکر شعر میں اظہار کردہ موضوع کی مناسبت سے ایک جمالیاتی تجربہ بھی بن جاتا ہے۔ایک اور شعر ؎

ریت ہی ریت رہ جائے گی دور تک
تیز دریا تو چڑھ کر اتر جائیں گے

یہ شعر بھی جمالیاتی تجربے کی عمدہ مثال ہے۔ دراصل کے۔ ڈی۔ مینی نے جن اظہارات کو اپنی شاعری کا ناگزیر عنصر بنایا ہے، اسے خیال کے اوپر خیال کا لباس اڑھانے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کے یہاں شاعری منظوم خیال کے نعم البدل کے طور پر نہیں آتی ہے۔ ان کی شاعری میں عقلیت کی سردمہری نہیں جذبے کی حرارت ملتی ہے اور انسان کے مسائل کی موجودہ صورت حال بھی۔آج جس طبقے کو روشن خیالی کا نمائندہ سمجھا جارہا ہے، ان میں سے بیشتر روشن نظری کے نشے میں چور انتہا پسندی کے باعث سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کا حریف ماننے سے بھی گریز نہیں کرتے اور اس طرح مادی دنیا کے لئے مذہبی اقدار کی کوئی اہمیت تسلیم نہیں کرتے۔کے ڈی مینی نے اس نظریہ کے خلاف اپنی شاعری بالخصوص نظموں میں صدائے احتجاج پوری شدت سے بلند کیا ہے۔ان کے نزدیک مذہبی اقدار سے دوری انسان کو وحشی بنادیتی ہے اور انسان کی قوت غلط استعمال کے سبب ظالم اور دوسروں کی ترقی کو اپنے اختیار کے آئینے میں دیکھنے کے نظریہ کو جلادیتی ہے جو کہ ایک آزاد، مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے کے لئے ناسور کی مانند ہے، جس کا اظہار ان کی شاعری میں جابہ جاملتا ہے۔یہ خصوصیات ان کے ایک بہترین شاعر ہونے کی ضمانت دیتی ہیں۔

نمونہ کلام

نام: خورشید احمد
قلمی نام: خورشید بسمل
پیدائش: ۱۹۴۷ء، چنڈی مڑھ
تعلیم: ایم ایڈ
پیشہ: رٹائرڈ ہیڈ ماسٹر
تصنیف: ابر نیساں (شعری مجموعہ)
پتہ: Muslim Educational Trust Baba Ghulam Shah Badshah Academy Thanna Mandi Rajouri-185212
موبائل: 9622045323
9086395995

غزل

میثاق ازل مجھ کو کچھ ایسے نبھانا ہے
آندھی میں مجھے جیسے اک دیپ جلانا ہے

ادراک ہی بے بس تھا، کچھ بھی نہ سمجھ پایا
آنے کا ہے کیا مطلب، کیوں لوٹ کے جانا ہے

احباب کی قبروں کو کیا دیکھتے آئے ہو
مٹی کے کھلونے ہیں، مٹی ہی ٹھکانا ہے

جینا کسے کہتے ہیں، آخر جو سمجھ آئی
"اک آگ کا دریا ہے، اور ڈوب کے جانا ہے"

اک کرب مسلسل ہے، سب مال و متاع بسمل
لٹتا ہے جو پاتا ہے، یہ قول پرانا ہے

خورشید بسمل

خورشید بسمل کے اشعار کی ایک اہم خصوصیت تو یہ ہے کہ انہوں نے زمانی تناظر کے حوالے سے موت کی آفاق گیر حقیقت اور زندگی کے حصار میں مقید انسانوں کی حاصل اور لا حاصل آرزوؤں سے ہم کنار زندگی کا خاکہ اپنی تخلیقی بصیرت کے آئینے میں کھینچا ہے۔ انسانی جسم کے زوال اور فنا کے درمیان خواہشات کا تصادم اور اس سے پیدا شدہ ذہنی الجھنیں خورشید بسمل کے اشعار کے بنیادی موضوعات ہیں۔ وہ اپنے ارد گرد کے ہولناک مناظر کو خاموش ناظر کی طرح دیکھنے کے قائل نہیں بلکہ تغیر وتبدل میں اپنی شمولیت کو بھی ناگزیر تصور کرتے ہیں۔ یہ شمولیت ان کے اشعار میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئی ہے۔

پھر تیرا کام رہے گا مرے سائے کی تلاش
میں اگر شہر تمنا سے گذر جاؤں گا

سمندر خامشی کا شش جہت ہے
ابھرتا، ڈوبتا رہتا ہوں اکثر

پیکر ہستی تھا بسملؔ بے نظیر
تم جگر کا خون اس میں گھولتے

کیوں پھینکتے ہو سنگ ملامت بلا دریغ
اک دور میں یہ شخص بھی محبوب رہا ہے

بند آنکھوں کا جاگتا منظر
آسمانوں سے پار ہوں گویا

خورشید بسمل کے یہاں احساساتی سطح پر آہستہ آہستہ سلگنے کی جو کیفیت ہے، وہ ایک

طرح کی بے بسی اور المنا کی کا اظہار یہ ہے۔ جس کا اثر ان کے لب ولہجہ اور تخلیقی آواز پر بھی ہے۔
خورشید بسمل کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے دور کے سیاسی انتشار پر نظر کرتے ہوئے ان کے تخلیقی ذہن پر افسردگی اور جنون کی ملی جلی کیفیت کا اثر ہے۔ خورشید بسمل کے اشعار میں ان کا حقیقی غم جھلکتا ہے۔ ان کی اب تک کی گزاری ہوئی زندگی کے تجربات، ان کی غم انگیز روح کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ان تمام غموں کے سامنے سپر ڈال دی ہے اور انہیں سے لذت لینے لگے ہیں۔ ان کے یہاں دوسری کیفیتیں بھی ہیں جن میں زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر کی گئی ہے۔

بستی والو! اب تم مجھ کو اپنا لو
اب تو سچ کہنے سے میں بھی ڈرتا ہوں

آئینے تو خود بھی میلے میلے ہیں
پوچھوں کس سے بسمل کیسا لگتا ہوں

اچھی قدریں ہی ہماری شان ہیں
ایٹمی طاقت پہ نہ اترائیے
بے خبر شیخ و برہمن کو نہ آئے موت کیوں
ہیں مصائب کا یہ باعث آج انسانوں کے بیچ
میں لڑ رہا ہوں بلا توقف، میں گر نہ جاؤں نڈھال ہو کر
جواب کی جستجو میں بسمل بکھر نہ جاؤں سوال ہو کر

خورشید بسمل نے تخلیقی سطح پر جو نظریات یا احساسات بیان کیے ہیں، وہ ایک طرح سے آزاد وجود اس طرح رکھتے ہیں کہ انہوں نے ان کا اظہار فن پارے کی ایک مخصوص شکل (غزل) میں کیا ہے۔ اور اس شکل میں اپنے بیانات کو اپنی حد تک اطمینان بخش اور بہترین بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح ان کی نظریاتی تنقید کی کارگزاریاں بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ خورشید بسمل نے الفاظ، تراکیب، واقعات اور خیالات کو رد و قبول کے مراحل سے گزارنے کے بعد اپنی تخلیقی

ترجیحات میں شامل کیا ہے۔اس میں وادئ جموں و کشمیر اور اردو دنیا کے دیگر فن پاروں سے استفادہ اور دیگر شعرا کے خیالات کا کسی حد تک اعتراف بھی موجود ہے۔دراصل اپنے پیش رووں کے خیالات اپنے ماحول اور اپنے مطالعے پر کچھ نہ کچھ تو اثر انداز ہوتے ہی ہیں۔لیکن ان کی آوازوں کے درمیان اپنی آواز کو برقرار رکھنا خورشید بسمل کا اپنا ہنر ہے۔

ان سے کچھ باتیں کر لی تھیں
سینے سے پتھر سرکایا
گھر میں جب بے گھر رہتے ہیں
روتے بام و در رہتے ہیں
دروازوں کو بند نہ سمجھو
لوگ چھپے اندر رہتے ہیں

پانی ہم پہ کیا برساتے
ہم پتھر میں آگ رہے ہیں
ہے عشق و مستی وہ روگ بسمل سلگتی رہتی ہے زندگانی
جو اس قیامت سے بچ کے نکلا، بلا شبہ باکمال ہوگا

خورشید بسمل نے ادبی تخلیق کے حوالے سے نفسیاتی اور تصوراتی دونوں قسم کا مواد دنیا میں پھیلے ہوئے انسانی شعور سے حاصل کیا ہے۔ان کی تخلیقی حسیت انسانی زندگی کے بعض جذبات کی ناکامی یا کامیابی نامرادی یا بامرادی جس سے انسانی شعور متاثر ہوتا ہے، کو عام سطح سے بلند کر کے اپنے شاعرانہ تجربات اور انداز میں پیش کرتی ہے۔ان کے اس قسم کے معنی خیز اشعار بعض جگہ تعجب اور بعض جگہ الجھن سے دوچار کرتے ہیں۔الجھن اس لیے کہ خورشید بسمل کے بعض اشعار میں تشریح و تعبیر کی سمتوں کا تعین نہیں ہو پاتا۔میرے خیال میں اس اسلوب کو بھی ان کے تخلیقی عمل کی ایک خصوصیت ہی کہا جا سکتا ہے۔اس لیے کہ ان کے اس قسم کے اشعار میں ذاتی زندگی کی سطح سے اٹھ کر روح کے اضطراب کو نمایاں کیا گیا ہے اور ان کے اس روحانی اضطراب کے آئینے میں ساری انسانیت کے روحانی اضطراب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔یہاں یہ نقطہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خورشید

بسمل کے یہاں ذاتی رجحان کی ایک اہمیت ہے، لیکن اسے انسانی زندگی کے دوسرے تقاضوں پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ یونگ نے اس تعلق سے بہت عمدہ بات کہی ہے:

"عظیم شاعری اپنی قوت، انسانی زندگی سے حاصل کرتی ہے اور ہم غلطی کریں گے اگر اس کو صرف ذاتی رجحانات کی دین سمجھیں۔"

(The Modern Man in Search of Soul, Page 191)

خورشید بسمل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

آنکھوں میں تیرتے ہوئے پانی کو دیکھنا
ٹھنڈے بدن میں خوں کی روانی کو دیکھنا

ادھر تیرے ستم کا سلسلہ رکنے نہیں پاتا
ادھر سینے کے اندر میں دل پتھر بناتا ہوں

جن سے عروس وقت کی چادر چمک اٹھی
ان موتیوں کو خاک میں کیوں رولتے ہیں لوگ

نہیں ان سے مجھ کو کوئی گلہ، جنہیں خیر وشر کا نہیں پتہ
جنہیں ہوش مندی کا زعم ہے، انہیں دور ہی سے ملا کرو

خورشید بسمل نے جو اشعار تخلیق کیے ہیں، بحیثیت قاری انہیں ان کی قدر و قیمت کا پورا احساس ہے۔ اس احساس کی ترجمانی ان کے دو اشعار جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، بخوبی کرتے ہیں۔

بسمل ترے بیان میں پیچیدگی نہ تھی
لفظوں کے آس پاس معانی کو دیکھنا

کوئی محظوظ ہو نہ ہو بسمل
مجھ کو اچھا لگے ہے فن میرا

نمونہ کلام

نام: خورشید احمد کرمانی
قلمی نام: خورشید کرمانی
ولدیت: حفیظ اللہ شاہ
پیدائش: جون ۱۹۵۴ء
تعلیم؛ بی۔اے (آنرز)
تصنیفات: دکھ کے موسم (شعری مجموعہ)
ذریعہ اظہار: اردو، پہاڑی، کشمیری
پیشہ: مدرس
پتہ: Mohalla Shankar Nagar Poonch
موبائل: 9419825854

غزل

گھر میں لگتی ہے بیابانی مجھے
چاٹ نہ لے دشت امکانی مجھے

امتحاں یوں میرے رہبر نے دیا
دے گیا اک سمت انجانی مجھے

پیاس بجھنے کا کوئی امکاں نہیں
آگ کر دیتا ہے اب پانی مجھے

میرے حق میں اب دعا کرتے رہو
مار نہ دے میری سلطانی مجھے

کیا پتہ ہے اب کہاں لے جائے گی
اس ''بدن'' دریا کی طغیانی مجھے

خورشید کرمانی

خورشید کرمانی کی شاعری کی اہم خصوصیت اس کا جدید لب ولہجہ ہے۔ الفاظ کے انتخاب کے تعلق سے یہ لب ولہجہ محض چند اقدار کی ترجمانی تک محدود نہیں ہے اور نہ ہی جدید لب و لہجے کے پس پردہ مواد انسانی عقل کی تجربہ گاہ میں کسی بے جان شئے کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ خورشید کرمانی فنی تخلیقی اظہار میں معنی خیز تجربے بیان کرتے ہیں، جس سے کہ شعر کی معنی خیزی میں تفکر کا آہنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ شعر ؎

ایک دن تو آؤ مر کے دیکھ لیں
اپنا نوحہ خود ہی کر کے دیکھ لیں

ظاہر ہے کہ آج کے سماج کا مشاہدہ کیا جائے تو موت سے بدتر زندگی یا یوں کہیں کہ جو زندگی کے اصل مفہوم و مقاصد ہیں، ان سے دوری خورشید کرمانی کے نزدیک آج کے سماج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ذہنی اور جذباتی سہاروں کے فقدان کے احساس نے اس آگ میں گھی کا کام کیا ہے۔۔ اس لیے انہوں نے اس فکر یہ احساس کی تفہیم کے سلسلے میں خاصی محنت کی ہے اور وہ پیرایۂ اظہار منتخب کیا ہے جو موجودہ انسانی صورت حال کو سمجھنے میں مددگار ہو۔ خورشید کرمانی کے اشعار سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے عملاً، امکاناً یا تخیلی سطح پر اسے جھیلا بھی ہے۔ انہوں نے عہد بہ عہد ہوتی ہوئی سماجی اور اقداری تبدیلیوں کے مطالعے کے لیے کتابوں سے زیادہ زندگی کے حوالوں کا سہارا لیا ہے اور اپنے تجربے یا تاثر کے تناظر میں کسی منطق یا نتیجے تک پہنچے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

پیاس بجھنے کا کوئی امکاں نہیں
آگ کر دیتا ہے اب پانی مجھے

خورشید کرمانی کے یہ جذبات فطری ہیں، جو نئے انسان کے باطن سے اٹھنے والے نئے سوالات سے عبارت ہیں کہ ہم یہ کس معاشرے کی تعمیر کر رہے ہیں اور خود کو ترقی یافتہ بھی کہہ رہے ہیں۔ فکر کی یہ تہ داری اردو شاعری میں ان کے مقام کی ضامن ہے۔

نمونہ کلام

نام: ذوالفقار نقوی

ولدیت: الحاج سید حیدر علی شاہ

پیدائش: ۱۰، جون ۱۹۶۵ء

تعلیم: ایم ۔اے (انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

بی۔ایڈ: جموں یونیورسٹی

بی۔یو۔ایم۔ایس: کلکتہ

پیشہ: سینئر لکچرار، شعبہ انگریزی

شوق: اردو، انگریزی شاعری

اشاعت: زادِ سفر (نعت وسلام اور قصائد پر مبنی شعری مجموعہ)

اجالوں کا سفر (غزلیات پر مشتمل مجموعہ)

رسائل و جرائد میں کلام:

قرطاس (یو۔کے) ثالث (منگیر)

تریاق (ممبئ) مژگاں (کلکتہ) انتساب (سرونج) تحریک

ادب (وارانسی) عکاس (لاہور) لوح (اسلام آباد) فروغ نعت (سرگودھا)

پتہ: Near Askari Imam Bargah Mehndhar,poonch

موبائل: 9797580748

غزل

لفظ شعلہ بدن ،حرف چنگاریاں
کیوں لگی ہیں تکلم کو بیماریاں

جس کے ہاتھوں میں کشتی کی پتوار ہے
اس کے خود ڈوبنے کی ہیں تیاریاں

دور تک ریگزاروں کا دریا رواں
کیا ہوئے کار ہائے شجر کاریاں

وہ جو خود ساز تھا، سب کا معمار تھا
راس ائیں نہ اس کو ادا کاریاں

خود وہ دامن بچا کر نکل جائے گا
دے کے تجھ کو جہاں کی جفا کاریاں

وہ شکار طلسمات محرومیت
کام ائیں نہ جس کو عزاداریاں

تیرا ملبوس تن اور کچھ بھی نہیں
سر کشی، خودکشی اور لاچاریاں

ذوالفقار نقوی

ذوالفقار نقوی کی شاعرانہ صفات میں جذباتی اضطراب کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ جذباتی اضطراب کبھی ہیجان کا روپ دھار لیتا ہے تو کبھی مصلح کے کردار پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق آج کے عہد کی ادبی فکر سے ہے اور دوسرے لفظوں میں یہ آج کے عہد کی ادبی فکر کا لازمی عنصر ہے۔ ذوالفقار نقوی نے اس کا اظہار اپنے اشعار میں یوں کیا ہے ؎

لے کے آئے گا مسیحا جب دوائے درد دل
جوڑتا رہ جائے گا تصویر کو تصویر سے

پھول کو خار سے ڈراؤ مت
اس نے دیکھے ہیں مرحلے سارے

خوف آتا ہے اپنے خیالات سے
کچھ سوالوں سے، ان کے جوابات سے

غور کیا جائے تو ان اشعار میں جو مضامین باندھے گئے ہیں، ان کا سرا بیسویں صدی کی حقیقت نگاری کے رجحان سے بھی جڑ جاتا ہے۔ ذوالفقار نقوی نے عام ذہنی فضا کی عکاسی اپنے اشعار میں بخوبی کی ہے جو داخلی اور خارجی نشیب وفراز میں الجھی ہوئی ہے۔ جہاں نئے شعور کی بادیہ پیمائی مادی نشیب وفراز تک محدود ہے۔ حالانکہ علامتی سطح پر بات اس سے آگے بھی نکل جاتی ہے۔ مثلاً سماجی اخلاقیات کی تگ ودو کا باطن کی تہذیب سے زیادہ خارج کی آرائش وتزئین پر مرکوز ہونا۔ اس طرح ایک نئی صورت جو سامنے آتی ہے، وہ جذباتی مسائل اور اس کی نفسیاتی ضرورتوں کو ثانوی خانے میں ڈال دیتی ہے اور مادی کامرانیوں کے حصول کا ذریعہ اور عملی جدوجہد کی قوت متحرکہ کو اولیت کا درجہ دے دیتی ہے۔

وقت کے پاس کہاں سارے حوالے ہوں گے
زیب قرطاس فقط یاس کے ہالے ہوں گے

پوچھتے ہو کیا مری تقدیر سے
کون ہے آشفتہ سر کے ساتھ ساتھ

آتا ہو جس سے حرف تریآن بان پر
بہتر ہے خاک ڈال تو ایسی اڑان پر

ذوالفقار نقوی نے آج کے سماج میں بڑھ رہی جارحیت پر گہرا طنز کیا ہے، ان کے نزدیک جارحیت اگر مثبت معنوں میں ہو تو تعمیر و ترقی کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے اور انسانی بقا کی ضمن میں ان دیکھی دنیاؤں کی تسخیر کے جذبے کی علامت بھی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ املا کی ہوس اور معاشی تحفظ کو نظر انداز کر کے اس فطری زندگی کے تصور کو حقیقت میں تبدیل کیا جائے کہ چونکہ زندگی کرنے کے تمام ذرایع سبھی کا مقدر رہوں گے اور اپنی اپنی صلاحیت اور بساط بھر ہر کوئی اسے حاصل کر سکے گا جیسا کہ فطری زندگی کا لازمہ ہے کہ اس میں عیاری، مکاری کا دخل بالکل نہیں ہے۔ تو جب سارے وسائل سب کے لئے ہیں تو پھر معاشی تحفظ کا تصور ہی باطل ہو جاتا ہے اور انسان اس سے بے نیاز ہو کر فطری زندگی کی متاع گمشدہ کو پھر سے حاصل کر سکتا ہے۔ اگر فطرت سے وابستگی اور تہذیب کی معصوم اور بے لوث قدروں کی طرف واپسی کا عمل نمونہ پا سکا تو ذوالفقار نقوی کے لفظوں میں:

وہی ہے پیرہن گل کا، وہی خوشبو، وہی رنگت
مگر یہ سارے منظر خون کے آنسو رلاتے ہیں

مرے کاندھوں پہ بار ہے اس کا
جو جنازہ ابھی اٹھا ہی نہیں

صحرا کے سلگتے ہوئے ذروں کی تپش سے
دم توڑتا ہر عزم جواں یاد رہے گا

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عزم جواں دم کیوں توڑ رہا ہے۔؟ جواب یہ ہے کہ انسان کی قوتیں جسمانی آشائش کے حصول میں صرف ہو رہی ہیں اور روحانیت سے دوری کے

سبب ذہن و دل پر جو زنگ چڑھ چکا ہے، اسے خود احتسابی، اپنے وجود اصل کی شناخت اور اایک ناپاک قطرے کے وجود سے پیدا شدہ اپنا وجود جیسے حقائق کے نشتروں سے کھرچ کھرچ کر زنگ کو ختم کر کے فطری معاشرے سے ہم آہنگی کی راہیں نہیں تلاشی جائیں گی، تب تک یہ منظر خون کے آنسو رلاتے رہیں گے۔اور یہ تذبذب برقرار رہے گا کے جو ہماری نظروں میں اچھا ہے، بھلا ہے، وہ واقعی اپنی اصل میں انسانیت اور معاشرے کے لئے قابل قبول اور صحت بخش ہے یا مضر۔؟ ذوالفقار نقوی کے چند اشعار۔

تیغ کس کی ہے، کس کے کہنے پر
کس کے سر کو تلاش کرتی ہے

چاک پر خاک خود بہ خود آ کر
کوزہ گر کو تلاش کرتی ہے

پہلا شعر اسی تذبذب کی آئینہ داری کرتا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔شعر بہت عمدہ ہے لیکن جب بڑا شاعر اس قسم کے عمل کا تحریری اظہار کرتا ہے تو شعر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے، اس کی بہترین مثال میں محمد علوی کا شعر ملاحظہ ہو۔

میں نے ہی اس کو قتل کیا تھا، یہ سچ ہے پر
سچ سچ بتاؤں، میرا بھی اک اک پہ شک گیا

یہاں کوئی تقابلی مطالعہ مقصود نہیں ہے اور یہ ناممکن بھی ہے ۔عرض یہ کرنا ہے کہ ذوالفقار نقوی کا تخلیقی ذہن بھی بڑے شاعروں کی فکر اور ان کے برتنے کے اسلوب کے آس پاس تک گردش کر لیتا ہے۔انہوں نے اپنے اشعار کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ زندگی سے متعلق ادبی موضوعات پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ انہوں نے سماج کو اس کی اپنی نارسائیوں اور پیچیدگیوں کا جو آئینہ دکھایا ہے اور اس کے اسباب اور نتائج بیان کیے ہیں، وہ دور حاضر کی ناقابل فراموش حقیقت ہے۔امید ہے کہ ان کا قلم آگے بھی سماجی حقیقتوں کو اسی طور نمایاں کرتے ہوئے ان کی ادبی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا رہے گا۔

نام: محمد رفیق انجم آوان
قلمی نام: رفیق انجم
پیدائش: جنوری ۱۹۶۲ء کلائی، حویلی، پونچھ
تعلیم: ایم۔بی۔بی۔ایس
پیشہ: ڈاکٹر
تخلیقات: خواب جزیرے (اردو شاعری) دل دریا (گوجری شاعری) غزل سلونی (منتخب گوجری غزلیں) سوچ سمندر (جدید گوجری شاعری) کورا کاغذ (گوجری افسانے) گوجری ادب کی سنہری تاریخ، سوغات (گوجری شاعری) گوجری کہاوت کوش، گوجری، انگریزی ڈکشنری، گوجری پرائمر، کاش! (اردو شاعری) سدھراں سلونیاں (پنجابی شاعری) قدیم گوجری ادب، جدید گوجری ادب، گوجری افسانہ، جدید گوجری غزل، تذکرہ گوجری شعراء، مختصر گوجری ڈکشنری، گوجری ہندی ڈکشنری، انجم شناسی
اعزازات: جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈمی ایوارڈ
پتہ: Dream Land College Road,Rajouri

Baam-e-Suraiya,Chandak,Poonch

موبائل: 9419054203

نمونہ کلام

غزل

پریشاں زندگی ہے، اور ہم ہیں
تری بیگانگی ہے ،اور ہم ہیں

شب تاریک میں یادوں کی خوشبو
ذرا سی چاندنی ہے ،اور ہم ہیں

ادھر موج جوانی ،اور تم ہو
ادھر تشنہ لبی ہے ،اور ہم ہیں

ہماری زندگی کیا زندگی ہے
کہ جاں تو چھن گئی ہے ،اور ہم ہیں

غموں کی بھیڑ میں کھوئے ہیں انجم
بس اک ان کی کمی ہے ،اور ہم ہیں

رفیق انجم

رفیق انجم کے یہاں جو غور وفکر کا رجحان ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ جبر و اختیار کی کشمکش ان کے تخلیقی ذہن کو فعال رکھنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ فکر کی آتی جاتی لہریں اپنے عدم تعین اور عدم استحکام کے باعث رفیق انجم کو کوئی بھی واضح موقف خواہ وہ مثبت ہو یا منفی کو اختیار کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ رفیق انجم کا یہ کہنا کہ ؎

ہماری زندگی کیا زندگی ہے
کہ جاں تو چھن گئی ہے اور ہم ہیں

ان کے تخلیقی اضطراب کے کشادہ اور لوچ دار ہونے کی دلیل ہے، وہیں ان کے اس شعر سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ کسی ایک فکری سانچے میں سمانے کے بجائے ان کا تخلیقی تغیر بیک وقت کئی سمتوں کا متلاشی ہے۔ ان کے تخلیقی ذہن کی کشمکش ایک طرح سے زندگی اور سماج کے دباؤ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے جسے رفیق انجم اپنی تخلیقی زندگی میں محسوس کرتے ہیں۔ یہ سفر افراد کی ذاتی زندگی، ان کے جذبات اور ان کی پریشاں خیالی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اقدار کی شکست اور باطنی زندگی کے بحران کو رفیق انجم نے اپنے دوسرے اشعار میں بھی مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ ان کے چند اشعار۔

تشنگی میری گئی نہ میری تنہائی گئی
دامن ہستی میں الفت کی کمی پائی گئی

سب سمندر بارہا کھنگال ڈالے ہیں مگر
حیرتوں میں ڈالتی ہے دل کی گہرائی مجھے

اب تو جینا لگے ہے جیسے میں
کوئی سنگیں گناہ کرتا ہوں

رفیق انجم نے انسان کے ایک فعال حقیقت ہونے کے بجائے سماج کے ہاتھوں میں ایک کمزور شئے ہونے کی جو عکاسی کی ہے، اس کی بنیاد پر اس عہد کو عقلیت، انسان دوستی، روشن خیالی، قومی آزادی، اقتصادی ترقی اور اس کا دور کیوں کر تسلیم کیا جائے۔ لیکن کوئی صورت زمانے کی بساط پر آخری صورت حال نہیں ہے یا نہیں ہوتی، یہ بھی آفاقی حقیقت ہے۔ اس لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نشیب و فراز کے تسلسل میں ہر فیصلہ وقتی قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے۔ رفیق انجم نے بھی زندگی کے اس دوسرے رخ پر نظر کرتے ہوئے جسمانی وجود کے دوسرے جواز تلاش کئے ہیں جہاں سماجی پیچیدگیوں کے باوجود ایک زندگی سے دوسری زندگی کے ربط، اس کی قدر و قیمت اور اس کی ضرورت اور اس سے انسلاک کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ رفیق انجم کے یہ شعر دیکھے جائیں۔

تم نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا
عکس مٹ جائیں گے سارے، آئینہ رہ جائے گا

مجھ کو لگتا ہے کہ اک دن تیرے میرے درمیاں
دوریاں مٹ جائیں گی اور فاصلہ رہ جائے گا

تیری آنکھوں میں زمانہ مجھ کو ڈھونڈے گا ضرور
اک نظر دیکھے گا اور پھر دیکھتا رہ جائے گا

کس کو تنہا چھوڑ دیں انجم کہ ہیں دونوں عزیز
منزلیں پالیں تجھے تو راستہ رہ جائے گا

مندرجہ بالا اشعار میں رفیق انجم نے رشتوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ان سے

معاشرے کے انسلاک اور اس کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔ یقیناً زندگی اور علم کے اس پردہ کے چاک ہوجانے کے بعد جس میں کہ انسان عقیدتاً یا پھر سہولتاً امن وسکون کے مصنوعی احساس سے دو چار تھا، ایک دوسرے کے ساتھ کے علاوہ اور کیا راستہ رہ جاتا ہے۔ حالانکہ ان رشتوں کے استحکام پر بھی شاعر کو اندیشہ ہے اور بعض اوقات یہ اندیشہ یقین کی صورت بھی اختیار کر جاتا ہے مثلاً دوریاں مٹنا اور فاصلے کا رہ جانا۔ اس کے ساتھ ہی سماجی الجھن یا پھر ذہنی الجھن میں سمتوں کے تعین میں بھی مستحکم مزاجی نہ ہونا اور اپنی کوتاہ نظری یا عدم استحکام کا سبب جھوٹی محبتوں یا پھر مسنوعی بہانوں میں تلاش کرنا اپنی خامیوں کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے۔ جیسا کہ چوتھے شعر سے ظاہر ہے۔ موجودہ انسان کا اپنی تہذیب سے وہ رشتہ نہیں رہا جسے کہ فطری زندگی کے جوہر کی صورت میں پیش کیا جائے۔ اس طرح بیزاری کے احساس کا روز افزوں بڑھتا جانا ایک لمحہ فکریہ ہے، لیکن پھر بھی تاریخ اور تہذیب کے ارتقا کے مسائل پر مختلف فکری زاویوں سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں، ان کی روشنی میں زندگی کو صرف روشن یا صرف تاریک کے خانوں میں نہیں بانٹا جاسکتا۔ اس متعلق رفیق انجم کہتے ہیں۔

ہیں لاکھوں تلخیاں، پھر بھی حسیں ہے
نہ ہو بیزار اتنا زندگی سے

زندگی اور سماج سے جڑے دوسرے مسائل کے متعلق رفیق انجم کے اظہارات یہ ہیں۔

جس کو جھکنے میں خدا کے سامنے بھی عار تھی
وقت سے پھر وہ جبیں پتھر پہ رکھوائی گئی

مرا دعویٰ ہے، پائے گا یہیں بکھرے ہوئے موتی
کوئی تاریک گلیوں میں کبھی جو روشنی بھر دے

تو نے پایا مجھے ،اور پھر کھو دیا

میں گیا وقت ہوں،اب صدائیں نہ دے

رفیق انجم کی شاعری میں امید پرستی بھی ہے اور مایوسی کا احساس بھی۔ان کی شاعری کی روشنی میں جو مسئلے بیان ہوئے ہیں،ان میں وقت کے تناظر میں انسان کے اپنے وجود کی حقیقت کا ادراک ہے۔یہی ادراک کبھی اسے وقت کے تسلسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی ایک سے خود کو مربوط رکھنے پر آمادہ کرتا ہے تو کبھی ایک سے زاید سے رشتہ استوار کرتا ہے۔اس طرح مراجعت،حال اور مستقبل کے ساتھ اس کا متوازی میلان اپنی وجودی کشمکش کے ساتھ بنا رہتا ہے

نام: روبینہ میر
قلمی نام: روبینہ
ولدیت: عبدالسلام میر
پیدائش: ۱۵، اگست
۱۹۶۹ء۔ بہروٹ، راجوری
تعلیم: بی۔اے، بی۔ایڈ
پیشہ: مدرس
تصانیف: آئینہ خیال (غزلیں، نظمیں)
تفسیر حیات (غزلیں، نظمیں)
حرف راز (غزلیں، نظمیں)
ضرب قلم (زیر ترتیب)
پتہ: Govt.Quarter Block-E
D.C Colony Rajouri-
موبائل: 9469177786
7006056715

نمونہ کلام

غزل

تلخیوں کے دم بہ دم بڑھتے ہوئے سائے ہیں ہم
زندگی کی ہر خوشی غم میں بہا آئے ہیں ہم

غیر دانستہ جو ان کو بے وفا ہے، کہ دیا
اس ذرا سی بات پر پھر کتنے پچھتائے ہیں ہم

یہ حقیقت ہے کہ ہم حالات سے غافل نہیں
تیز تر طوفان سے بھی کیسے ٹکرائے ہیں ہم

کیا اسی جمہوریت پر ہم کو اتنا ناز ہے
جرم ہم سے ہو نہ ہو، لیکن سزا پائے ہیں ہم

زندگی میں کرتے ہیں ہم لغزشوں پہ لغزشیں
کیا بتائیں خود سے ہی کس درجہ شرمائے ہیں ہم

روبینہ میر

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی شاعر کی تخلیق میں اس دور کے غالب مسائل اور اِس کے توسط سے سماجی، اِقتصادی اور بعض اوقات سیاسی رُجحان بھی نمایاں ہوتا ہے۔ یہ ہر دَور کے کم از کم عمدہ شعراء کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ اِنھیں رجحانات کے درمیان بہت سے اشعار یا کچھ اشعار ایسے تخلیق ہو جاتے ہیں جو شاعر کی اپنی شناخت کے ضامن بن جاتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں ایک ہی مسلئے کو مُختلف زاویۂ نظر سے دیکھنے، اس پر غور و فِکر اور اِسے اپنے مخصوص انداز میں ڈھال کر پُر اثر یا چونکا دینے والے اسلوب میں پیش کرنے سے جہاں شاعر کی شعری صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اِس کی منفرد یا مختلف زاویۂ نگاہ اور زندگی اور معاشرے پر اِن کی گہری نظر کا بھی ادراک ہوتا ہے۔ روبینہ میر ہمارے عہد کی ایسی شاعرہ ہیں جنھوں نے نسوانی احساسات کو اپنی شعری حسیت میں اولیت کا درجہ نہیں دیا ہے بلکہ اِس کو دوسرے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے برابر ہی متوازن رکھا ہے۔ یہ امر شعوری ہے یا لاشعوری، اِس سے زیادہ اہمیت اِس بات کی ہے کہ وہ اُردو ادب کی ان شاعرات سے مختلف ہو گئیں ہیں جِن کا اوڑھنا، بچھونا ہی نسوانی احساسات ہیں اور وہ نسوانی احساسات جن میں خود کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم ثابت کر دینا، سمجھنا یا ماننا ہی اُن کی شاعری کی کلید ہے۔ روبینہ میر کے چند اشعار دیکھے جائیں:

وہ جو دیکھے تھے میں نے کبھی خواب میں
بہہ گئے پھول سارے وہ سیلاب میں

جتنے بھی زخم تھے خود بخود بھر گئے
جب سے دیکھا ہے اِک داغ مہتاب میں

بادشاہِ وقت تھے جو لوگ، سائل ہو گئے
زندگی میں ہاتھ پھیلائے پہ سائل ہو گئے

زِندگی میں صاف گوئی سے لیا ہے ہم نے کام
بس اِسی اِک بات سے پیدا مسائل ہو گئے

تیری کوئی بات روبینہ، نہ تھی ان کو پسند
سخت حیرت ہے مجھے، وہ پھر بھی قائل ہو گئے

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ روبینہ میر نے مشرقی روایتوں سے برأت کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اُنھوں نے جِن بدلے ہوئے حالات کا تذکرہ کیا ہے، ان کی نوعیت تخلیقی ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی بھی ہے۔ اِس طرح اِن کی یہ شعری جہت کسی نئی جمالیات کے بجائے ایسے مصالح کا روپ دھار لیتی ہے جو شاعری کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔ اپنے فن کے معیار کے تعلق سے اُنھوں نے تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں اور انفرادی استعداد کے مطالبات کے جبر کو قبول نہیں کیا ہے بلکہ شعری اصولوں کو ایک کلیے کے طور پر برتنے کی سعی کی ہے۔ اِن کے احساسات سوچے ہوئے خیالات کو وہ لفظی ڈھانچہ عطا کرتے ہیں جو مبالغے سے پاک اور اصلیت کے تصورات سے وابستہ ہیں۔ اِن کے اشعار اپنے شعری تجربے کی ترسیل کے سلسلے میں اپنی اہمیت کو واضح طور سے منوا لیتے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

خواب آنکھوں میں نہیں تھا کوئی بھی
خواہش تعبیر ہم کرتے رہے

بات پیچیدہ نہ تھی اِتنی کبھی
جس قدر تفسیر ہم کرتے رہے

وہ جن کے لہو رنگ سے یہ شہر سجا ہے
گھر ان کے ہوئے زیر و زَبر دیکھ رہی ہوں

گمراہی و غفلت بھی، وحشت کے اندھیرے بھی
اے کاش! کہیں "لو" کا سامان بھی کر دیتے

صورتِ جلاد میرے شہر میں

ہر کوئی آزاد میرے شہر میں

روبینہ میر نئے عہد کی تہذیب و ترقی کے ایک نئے تصوّر میں اقدار کی افادیت اور اِس کے سماجی کرداروں کا مثبت اِنسلاک چاہتی ہیں۔ وہ ادب کی حدود، اس کے طریقِ کار اور اِس کے مزاج کی نوعیت سے بے خبر نہیں ہیں۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ اِن کے اشعار ایک متعینہ مقصد کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ بعض اوقات اِن کے یہاں جو گہری جذباتی کشمکش دیکھائی دیتی ہے وہ ادب کے عملی مسائل سے تعلق رکھتی ہے وہ، اِس کے لئے شعر کے اسرار اور تخیل سے اِن سے اِنسلاک کی اِس صورت کی حمائت کرتی ہیں جو اِنسان کو تخلیقی لمحات میں زمان و مکان کی معنویت اور مادی رِشتوں کی تفہیم و تعبیر میں معاون ہو۔ اُنھوں نے شعر گوئی کے عمل میں اس ہوش مندی کو ہر مقام پر ملحوظ رکھا ہے، جو اِنھیں جنون کی منفی صورتوں کے حصار میں گُم نہیں ہونے دیتی۔ چند اشعار:

روبینہ لوگ شادماں لگتے ہیں کس قدر

پڑھتے نہیں ہیں غالباً اخبار آجکل

ہزاروں غلط کام کرتے ہیں ہم

زمانے کو بدنام کرتے ہیں ہم

بشر کی زندگی کے روح افزا باب لاؤ گے

کہاں سے مشرقی تہذیب کے آداب لاؤ گے

ہر گماں اِک واہمے میں ڈھل گیا ہے باخدا

خوش گمانی، کیا گماں کی بدگمانی دے گئی

ٹوٹتے، بنتے، بکھرتے، دائروں کے روپ میں

وہ مجھے الفاظ میں بکھری کہانی دے گئی

روبینہ میر کی شاعری کے اِس رنگ کو دیکھتے ہوئے اِسے اُردو ادب کی معیاری شاعری میں اضافہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

نام: محمد رشید
تخلص: قمر
پیدائش: ۱۹، جولائی ۱۹۵۰ء
تعلیم: ایم۔اے(اردو)
پیشہ: مدرس
کلچرل آفیسر انچارج، کلچرل اکیڈمی سب آفس، راجوری
پتہ: Thanna Mang Darhaal: Malikan Dist Rajouri-185135
موبائل: 9596930660

نمونہ کلام

غزل

کل رات ہجرتوں کے سمندر بدل گئے
ساحل مقیم حسرتوں کے گھر نکل گئے

میں موسموں کی آہٹوں کا منتظر رہا
اور وادیوں سے دور بھی منظر بدل گئے

ہمراہ میرے کوئی بھی آتش فشاں نہ تھا
کن آبلوں کی آنچ میں پتھر پگھل گئے

سب رفعتوں کا قرض چکا جائے گا پرند
لیکن اڑاں سے پہلے ہی جو پر سنبھل
گئے

شیشے کے جنگلوں پہ رکی دھوپ تو کھلا
سارے قمر وجود سے ہٹ کر نکل گئے

رشید قمر

رشید قمر کے فن پر کچھ گفتگو کرنے سے پہلے ان کی دو نظموں کو دیکھا جائے جو کہ میرے خیال میں ان کے تصورات فن کی کلید ہیں، جس میں سے ایک کا عنوان نظم ہے۔

بارش کی بوندیں اتری ہیں
گھاس اگی ہے
آگ جلی ہے
قطرہ قطرہ پیاس بڑھی ہے
رستے کے پتھر سلگے ہیں
دھواں اٹھا ہے
موسم ننگے پاؤں چلا ہے
ساحل پہ اک دیا بجھا ہے
مٹی کی خوشبو جھلسی ہے
ماں اک رت ہے
ماں کے سر کی نیلی چادر چیخ رہی ہے
چھت پہ دھوپ کی تہہ جمی ہے
کائنات کا ہے پیغام
سبز سیارہ ہے بس تیرا
پتھر بن کر مت ٹکراؤ
پتھر ہی سے آگ اگی ہے

(نظم)

دوسری نظم یہ ہے:

ہوا کی ایک جھونک سے

ہزاروں ہجرتیں ممکن ہو جاتی ہیں
بس اک لمحے میں
تخلیق کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے
تو پتے روٹھ جاتے ہیں
صدائیں رفعتوں سے اتر کر مایوس ہوتی ہیں
سیاہی کا سمندر قلم پی لینے سے قاصر ہے
فراز کوہ پر اڑتا پرندہ دور بیٹھا ہے
نئے موسم کی پہلی برف اس کو چاٹ جائے گی
نوکیلی چوٹیوں پر سسکیاں محسوس ہوتی ہیں
شعاع اٹکی سی لگتی ہے
ہوا تاریخ لکھتی ہے
مگر کالا سمندر چاٹ کر بھی
قلم قاصر ہے کہ
مری کہانی کا سرخ عنوان لکھ پائے

(بلاعنوان)

ان دونوں نظموں کے الگ الگ مصرعوں میں الگ الگ منظر بیان کیا گیا ہے اور آخری کے مصرعوں میں ان تمام کو ایک گل دستے کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس گل دستے کے توسط سے رشید قمر نے جن واقعات کی منظر کسی کی ہے، ان میں فکر اور عقلیت کا ایک متوازی میلان نظر آتا ہے، اس میں جدید مسائل جو کہ اپنے ماضی سے منسلک ہیں اور تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں، کی تصویر ابھرتی ہے۔ اپنے دور کی ذہنی فضا اور نظریاتی ادھوری سچائیوں کے اظہار کا جو کرب ان نظموں میں جھلکتا ہے، وہ تہذیبی اور ذہنی زندگی کے خاکوں کے کئی رنگوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ میرے خیال میں ان نظموں کی کم از کم اس مضمون میں تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ رشید قمر نے ان کو اتنا پیچیدہ مفہوم بھی عطا نہیں کیا ہے کہ کسی سخت الجھاؤ کا گمان گزرے۔ دوسرے یہ کہ ان نظموں کے تعلق سے جو گفتگو اوپر کی گئی ہے، وہ مناسب ہے۔

تیسرے ایک سے زاید معنی رکھنے کے سبب قاری کے اپنے ذاتی معنی ومفہوم کی تکمیل بھی کرتی ہیں۔ ویسے رشید قمر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، اس لیے ان کی غزلوں کے چند اشعار بھی دیکھے جائیں۔

لے جاؤ قمر ساتھ نشاں ان کے قدم کا
یہ کفن کی تقدیس ہے، دھویا نہیں جاتا

مرے احساس کا مومی پرندہ
فضاؤں میں پگھلنے جا رہا ہے

جنوں ہے، یا قمر بے اعتباری
قبیلہ گھر بدلنے جا رہا ہے

مندرجہ بالا اشعار اپنے عہد کی ذہنی اور جذباتی فضا کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان اشعار کی فکری سطح پر غور کیا جائے تو قدامت اور جدت کے تصور کی ہم آہنگی رشید قمر کے ذہنی ارتقا اور تخلیقی ذہن کے وجود کی تمام جہتوں کے متعلق یہی تاثر ابھرتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں عقیدہ پرستی یا تہمات کو علامتی یا استعاراتی طور پر دیومالائی تصورات کا حصہ نہیں بنایا اور نہ ہی ان سے مراجعت کا کوئی نقش ابھرتا ہے۔ ان کے اشعار میں حقیقت بیانی موجودہ انسانی صورت حال کے مختلف زاویوں کو مختلف طور پر برتتی ہے۔ کفن کی تقدیس، آبلو کی آنچ، شیشے کے جنگل احساس کا مومی پرندہ، ایسے فقرے، ایسی اصطلاحیں ہیں جن کے استعمال کا فن ہی رشید قمر کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف کرواتا ہے۔

نام: ڈاکٹر زرینہ اختر میر

تعلیم: ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

پیشہ: تدریس

تصنیفات: اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ

اصول تدریس برائے بی۔ایڈ

مشعل حیات

اردو کیسے پڑھیں، برائے بی۔ایڈ

مختصر اردو گائڈ برائے جماعت بارہویں

Beacon on the way

پتہ: VillageKhablan Thanna Mandi Rajouri

ڈاکٹر زرینہ اختر میر

ڈاکٹر زرینہ اختر میر پیر پنچال ریجن کی ایک اہم نثری شخصیت ہیں۔ ۲۰۰۸ء میں ان کی تحقیق وتنقید پر مبنی کتاب 'اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ' منظر عام پر آئی تھی جس نے بہت داد و تحسین وصول کی۔ان کا ادبی سفر آج بھی جاری ہے اور خطہ کی ادبی برادری کی ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔اپنی اس کتاب میں ڈاکٹر زرینہ میر نے اردو ڈرامے کی تمام اصناف کا فکری مطالعہ پیش کیا ہے۔اس کتاب میں مضامین کی جو فہرست دی گئی ہے وہ درج ذیل ہے۔

۹۔اردو ڈرامے کی تنقید کی مجموعی صورت حال

جیسا کہ فہرست میں شامل عنوانات سے ہی عیاں ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کو لکھنے میں ڈاکٹر زرینہ اختر نے کس قدر عرق ریزی سے کام لیا ہے۔اپنے پیش لفظ میں وہ لکھتی ہیں۔

''ڈرامے کو نہ صرف عالمی ادب میں خاصی اہمیت حاصل ہے بلکہ اسے دیگر تمام اصناف ادب سے قدیم بھی تصور کیا جاتا ہے، لیکن اس صنف کو ایک باقائدہ فن کی حیثیت بہت دیر سے حاصل ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو دوسری اصناف کو ہوئی۔یہی نہیں جب ہم اردو ڈراما کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو میں ڈراما کا آغاز بہت دیر سے ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو ایک غیر سنجیدہ اور لغو صنف تصور کیا جانے لگا۔اکثر ادیبوں نے اسے شجر ممنوعہ سمجھ کر ہاتھ نہ لگایا۔چنانچہ ابتدا سے ہی ڈراما عدم توجہی کا شکار ہو گیا جس سے اس کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی مستند ادیب اور ڈراما نگار اس صنف کی جانب متوجہ ہوئے۔انہوں نے نہ صرف بہت سے ڈرامے تصنیف کئے بلکہ اس صنف کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں کی طرف بھی توجہ کی۔چنانچہ ڈرامے کے فن اور تکنیک پر کئی تصانیف منظر عام پر آئیں جن میں ڈرامے کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔'' (پیش لفظ،صفحہ،۱۰)

ڈاکٹر زرینہ اختر میر نے مندرجہ بالا سطور میں اردو ڈرامے کی ابتدائی صورت حال کی عکاسی کی ہے،لیکن سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا وجوہات رہیں،جس کے سبب صنف

ڈرامہ کا وجود اردو ادب میں دیر سے ہوا اور اس کے بعد اس کو اعلیٰ مقام تک پہنچنے میں عرصہ لگ گیا۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس دور میں معاشی طور پر، خاص کر وہ معاشرہ جو کہ خود کو اردو داں تصور کرتا تھا، قدر خوش حال تھا، اس لئے غزل اور نظم میں وہ اعلیٰ معیار قائم ہو گئے تھے، جن کے تحت نظیرا کبر آبادی کی شاعری بھی اس کے لائق نہ سمجھی گئی۔میر تک کو کہنا پڑا کہ

''شعر میرے ہیں گوخواص پسند۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پر مجھے گفتگو عوام سے ہے''

ویسے بھی اردو ڈرامہ یا تو عوامی تفنن طبع کا سامان تھا یا پھر ان کی اصلاح کا، جس کی شائد خواص یا پھر اس اردو داں طبقے کو اس کی بہت زیادہ ضرورت نہ تھی، اور کیوں کہ ادنیٰ اور اعلیٰ کا معیار طے کرنے کی ذمہ داری بھی انہیں کے سر تھی۔آغا حشر کاشمیری جنہیں اردو ڈرامے کا شکسپیئر کہا جاتا ہے۔جن کے ڈرامے خاص وعام میں یکساں مقبول تھے۔عام میں تو وہ اس قدر پسند کئے جاتے تھے کہ رکشا چلانے والے اور وہ مزدور طبقہ جو روزانہ کمانے اور کھانے پر انحصار کرتا تھا، جب آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے اسٹیج ہونے کے لئے آتے تھے تو وہ اتنا ہی کماتا تھا کہ جتنے میں اس کی دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو جائے۔اس کے بعد وہ اپنا کام بند کر کے ڈرامہ دیکھنے چلا جاتا تھا۔آغا حشر کاشمیری کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ڈرامہ تخلیق کرتے وقت ،مزدوروں رکشے والوں اور دیگر نچلے طبقوں سے رائے مشورہ کرتے تھے اور ان کی پسند اور ناپسند کا ڈرامے کی تخلیق میں خاص خیال رکھتے تھے۔رہی بات بعد میں ادبا وشعرا کے اس جانب توجہ کرنے کی تو اس کا سبب بھی وہی ہے جو کہ نظیر کی شاعری کی موجودہ قدر و قیمت کے بدلتے معار اور روز بہ روز اس کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا ہے کہ جب ادب برائے ادب کا فلسفہ ادب برائے زندگی میں منتقل ہوا تو آج اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ آج اردو ادب کی صف اول نظیرا کبر آبادی کے بغیر مکمل نہیں ہے۔اسی طرح اردو ادب آج صنف ڈرامہ کے بغیر نامکمل ہے۔ایک بات اور یادرکھنے کی ہے کہ جب ڈرامہ کی صنف اردو ادب میں برتی جارہی تھی تو نئی صنف ہونے کے سبب اس کے مسائل پر گرفت بھی کم تھی۔شائد یہی وجہ ہے کہ اس کو اعلیٰ معیار تک پہنچنے میں وقت

لگا۔سجود سیلانی ڈرامہ نگاری کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''ڈرامے کا بنیادی فارمولا اگر چہ بھرت منی اور ارسطو کا ایک جیسا ہے تاہم دونوں کے یہاں الگ الگ نظریات ہیں۔ارسطو کی نظر میں ڈرامہ ایک لطیف آرٹ کی حیثیت رکھتا ہے جس کا خالق محض انسان ہے اور انسان کے سوا کوئی نہیں، البتہ بھرت منی کے ناٹیہ شاستر نے ناٹک کو مافوق الفطرت قوتوں کی ایجاد قرار دے کر تقدس اور احترام کے مستحق بنایا۔ناٹیہ شاستر کے اولین ابواب میں درج ہے کہ ایک مرتبہ اندر کی قیادت میں سارے دیوتا برہما کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ ہمیں ایک ایسا آرٹ عطا کیجیے جو دیکھا بھی جا سکے اور کانوں سے سنا بھی جا سکے۔اس پر برہما نے ''رگ وید'' سے پاٹھ یعنی کلام ''سام وید'' سے سنگیت ''یجر وید'' سے ابھینئے یعنی اداکاری اور ''اتھر وید'' سے نورس لیکر ناٹیہ کلا کی تخلیق کی اور اسے بھرت منی کو دے دیا۔بھرت منی نے اپنی صلاحیت سے چاروں فنون کو ترتیب دے کر ناٹیہ شاستر کی صورت میں ہم تک پہنچایا۔اس طرح دیو مالائی عقیدے کے مطابق ناٹک کے فن پر دھارمک مہر ثبت ہو گئی اور یونانی ڈرامے کے برعکس ہندوستانی ناٹیہ کلا کے پس منظر میں مائتھولاجکل جواز کارفرما ہے۔''

(ڈراما نگاری کے بنیادی مسائل۔از۔سجود سیلانی۔مطبوعہ، ہمارا ادب۔تھیئٹر نمبر۔۲۰۱۱۔۲۰۱۰۔ص۔۲۶۳۔۲۶۲۔)

اب یہاں ڈرامے کے موضوعات کے متعلق دو صورتیں سامنے آئیں۔ایک تو مشرق میں ڈرامے کی تہذیبی اور ادبی حیثیت سے زیادہ اس کی مذہبی حیثیت اور جس کا مغرب میں ارسطو کے مطابق کوئی وجود نہیں ہے۔اب جب ان دونوں کا اثر اردو ڈرامہ نگار لے گا تو ظاہر ہے کہ کوئی تیسری شکل بنے گی،اور یہیں سے ردو قبول اور معیار کے مدارج کے تعین کا سلسلہ بھی شروع ہوتا ہے۔جیسا کہ زرینہ اختر نے اردو کے پہلے ڈرامے کے متعلق لکھا ہے کہ۔

''ماہر فن کا کہنا ہے کہ ڈرامہ کا فن دنیا کی ابتدا سے موجود ہے۔اگر چہ ڈراما کا باضابطہ وجود نظر نہیں آتا۔جہاں تک اردو ڈرامے کی باضابطہ ابتدا کا تعلق ہے تو یہ سوال ایسا ہے کہ جس کے متعلق محققین کسی ایک رائے پر متفق نہیں ہو پائے تاہم اکثر ناقدین نے اردو ڈراما کی ابتدا کو نواب واجد علی شاہ اختر سے منسوب کیا ہے اور ان کی تخلیق کردہ رہس ''رادھا کنھیا کا قصہ'' کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیا ہے جو تقریباً ۱۸۴۳ء میں اودھ کے شاہی دربار میں اسٹیج کیا گیا۔''

(اردو ڈرامے کی تنقید کا

جائزہ۔ص۔۳۲)

اس تعلق سے انہوں نے حوالے بھی مستند دئے ہیں۔لکھتی ہیں۔

''سید مسعود حسن رضوی ادیب اور ڈاکٹر ظہور الدین نے اسی رہس کو ڈرامے کا اولین نمونہ قرار دیا ہے۔ڈاکٹر ظہور الدین لکھتے ہیں۔

''اردو میں ڈرامے کی روایت کا آغاز واجد علی شاہ کے 'رادھا کنھیا کا قصہ' سے ہوا کہ جسے مصنف نے ۱۲۵۸ھ میں تخلیق

کیا۔"

(ایضاً)

اب جب کہ اردو میں بھی ڈرامے کی ابتدا یہاں کی مذہبی روایت کے آئینے میں پروان چڑھے تو ظاہر ہے کہ اسے مشرق و مغرب کے معیار پر پورا اترنے میں وقت تو لگے گا۔ سجود سیلانی نے بڑی عمدہ بات کہی ہے۔

"یونانی اور ہندوستانی دونوں تہذیبوں کی مہیا کردہ اس اساس سے واضح ہوا کہ ڈرامے کی صنف فنون لطیفہ کے رنگا رنگ پہلوؤں کا ایک گراں قدر گلدستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس فن میں ایسی صفات موجود ہوں، اس پر طبع آزمائی کرنا کس قدر مشکل ہے۔ ڈرامہ نگاری اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ قلم کار کو شاعری، رقص، موسیقی اور مصوری پر دسترس حاصل ہو لیکن ایسی جانکاری حاصل کرنا ہر قلم کار کے لئے قطعی ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میدان ادب میں تعداد کے لحاظ سے ڈرامے قلیل ہی نظر آتے ہیں۔"

(ایضاً، ص ۲۶۳)

جب ڈرامے کی صنف کو کامیابی سے برتنے کے لئے تین اہم اصناف شاعری، رقص اور موسیقی پر دسترس حاصل ہونا چاہئے تو اردو ڈرامے کی تخلیق کے لئے اس میں ایک مسئلہ اور جڑ جاتا ہے، اور وہ ہے مشرق و مغرب کے ڈرامائی نظریات کے پیش نظر دونوں رویوں کو باہم منسلک کر کے اور اس میں اردو کا خمیر اس طرح پیوست کرنا کہ ڈرامہ اردو کا ہی ڈرامہ لگے، قدر دشوار عمل تھا جس کو سر کرنے کے لئے وقت درکار تھا۔ ڈرامے کے لئے منتخب کردہ موضوعات کے متعلق بھی اردو ڈرامہ نگار کو غور و فکر کی ضرورت تھی، کیوں کہ بقول سجود سیلانی۔

''موضوع کا انتخاب کرنے کے لئے ہمارے معاشرے میں ان گنت مسائل موجود ہیں۔مثال کے طور پر جہیز کا مسئلہ،قومی یک جہتی،خاندانی منصوبہ بندی،انسان دوستی،تعلیم نسواں،اپاہجوں کی بہبودی،جنگلات کا تحفظ،بیروزگاری،جنگلی جانوروں کا تحفظ،چور بازاری،اسمگلنگ،ملاوٹ کی وبا،دوستی،مہر و وفا،بے وفائی،یار ومحبت،طلاق،ساس اور بہو کے درمیانی تفاوت،جنگ امن،،رشوت ستانی،جرم وسزا،زر پرستی سخاوت، ،ظلم ،عدل،قربانی،ایثار،بھوک،افلاس وغیرہ ایسے لاتعداد موضوعات ہیں جن پر ڈرامے لکھے جا سکتے ہیں۔البتہ قتل،خودکشی،جنسیات اور آسیبی موضوعات ہماری سماجی قدروں کے منافی ہیں کیوں کہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ پر ڈرامہ یک لخت چھا جاتا ہے،اس لئے ایسے موضوعات کے ڈرامے دلوں میں خوف وہراس اور ہیجان پیدا کر کے انسانی احساس اور اخلاق کو جھنجوڑ کر رکھ سکتے ہیں۔جہاں تک قتل،خود کشی ،آسیبی اور جنسی موضوعات کا تعلق ہے ،بھرت منی نے حقارت سے ان کو ''بھینکر رس''یعنی خوف وہراس اور ہیجان پیدا کرنے والا مواد کہ کر ہندوستانی معاشرے کے منافی قرار دیا ہے،کیوں کہ ''بھینکر رس'' ہندوستانی مزاج کے خلاف ہے۔''

(ایضاً۔ص۔۲۶۶۔۲۶۵۔)

اب غور کریں تو 'جنگ' میں قتل وخوں ،غارت گری تمام چیزیں شامل ہیں۔آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ 'رستم وسہراب' اس کی بہترین مثال ہے۔لیکن اس کا اختتام ہندوستانی سماجی

قدروں کے عین مطابق ہے۔تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موضوع چاہے جو بھی ہو،اس کا اختتام اس طرح ہو کہ اس میں ہندوستانی قدروں کا اظہار ہو۔تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لیلیٰ مجنوں اور اس جیسے قصوں پر مشتمل ڈراموں کو الگ کر دیا جائے تو بھی ہیر رانجھا اور شیریں فرہاد کے قصے پر اور اس قسم کے دوسرے اختراعی قصوں پر مشتمل ڈراموں کا کیا بنے گا،جس میں اختتام خودکشی پر ہوتا ہے۔اور دوسری بات یہ کہ بھینکر رس والا نظریہ مغرب میں تو ہے نہیں ۔یہاں ہمارے اردو ڈرامہ نگار مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مشرق و مغرب کے ڈراموں کے موضوعات پر نظر رکھتے ہوئے اور اردو کی اپنی مخصوص روایت کو کام میں لاتے ہوئے وہ تیسری راہ متعین کی جو اردو ڈرامے کی انفرادی شناخت کی ضامن بن گئی۔ڈاکٹر زرینہ اختر نے اپنی اس کتاب میں جس مستند طریقۂ کار سے حوالوں کے ساتھ ڈرامے کی مختلف قسموں پر گفتگو کی ہے،وہ ان کی کتاب کے معیار و وقار کی ضامن ہے۔یک بابی اردو ڈرامے جن کے بارے میں مواد کافی کم ہے،اس پر بھی انہوں نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔یہاں مجھے رفعت شمیم کا مضمون ''اردو یک بابی ڈراما'' یاد آتا ہے ۔انہوں نے اس میں بڑی کارآمد باتیں لکھی ہیں ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔

> ''یک بابی درامہ میرے نزدیک سہل ممتنع کے مترادف ہے، جس کی محدود ہیت میں وسعت کو سمونا بڑی جانفشانی اور عرق ریزی کا کام ہے۔اس صنف کا اختصار تخلیق کار کے فکر و قلم پر پابندیاں عائد کرتا ہے کہ اسے طویل ڈرامے کی طرح نہ تو پلاٹ کے تدریجی ارتقا کا وقت نصیب ہے اور نہ ہی مکالموں کے ڈرامائی تسلسل کا موقعہ۔مرکزی اظہار خیال کچھ ہی وقفے میں روایتی قید و بند سے بے نیاز ہو کر ہر سمت اپنے تاثر کے تار و پود بننے لگتا ہے۔یہی سبب ہے کہ اس صنف کے اندر کردار و عمل کا بتدریج نشو و نما پانا ممکن نہیں۔پردہ اٹھتے ہی

ڈرامائی عمل کی رفتار، کہانی کا ارتقا اور کرداروں کی کشمکش کا عروج
دیکھنے والوں پر عیاں اور اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ یہ
خیال کہ یک بابی ڈرامے کی تخلیق ایک طویل ڈرامے کی بہ
نسبت آسان ہے، صریحاً گمراہ کن ہے۔"
(یہ زندگی، یہ تماشے۔از۔رفعت شمیم ص۔ ۷)

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زرینہ ختر کی کتاب "اردو ڈرامے کی تنقید کا تجزیہ"
جہاں شائقین علم و ادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہیں نو واردان
ادب کے لئے مشعل راہ کی مانند ہے

زنفر کھوکھر

نام: زنفر کھوکھر
پیدائش یکم جون ۱۹۷۱ء پونچھ
تعلیم ایف ۔اے
تصنیف عبرت (افسانوی مجموعہ)
پیشہ: رٹائرڈ مدرس
پتہ: Mandi Tahseel Poonch
فون نمبر: 9419609369

زنفر کھوکھر

زنفر کھوکھر کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ان آداب کا خیال رکھا ہے جو کہ اخلاقیات کے دائرے میں آتے ہیں۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاشرتی احوال وکوائف اور مذہبی قدریں ان کے لیے تذبذب اور کشمکش کا باعث ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنے نسوانی دائرے میں رہ کر ان تمام سماجی اور اخلاقی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جو کہ اب ناسور کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے ان نقات کا بھی خیال رکھا ہے جس میں عورت کی عزت وآبرو ہر طرح مردانہ نقطۂ نظر سے محفوظ رہے اور جب یہ مثبت رویہ منفی صورت اختیار کرتا ہے یعنی جب اس کے پس پردہ جائز، ناجائز خواہشیں پوری کی جانے لگتی ہیں تو زنفر کھوکھر کا قلم اس پر بھی طنزیہ انداز میں سوال اٹھاتا ہے۔ان کا ایک افسانہ ''عبرت'' اسی انداز کا ہے۔اس کے چند اقتباسات دیکھے جائیں۔افسانے کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

> ''مولوی باسط علی نے بیوی کو گھر سے کیا نکالا، سارا گھر ہی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ روپیہ، پیسہ، زیور، برتن، کپڑے، بستر، اناج اور دیگر سبھی کارآمد چیزیں اور حد یہ کہ ان سبھی چیزوں کے غائب ہونے کی مولوی جی کو خبر تک نہیں ہوئی۔''

> ''بچوں کے لیے (بچوں کی پیدائش کے لیے) دوسری شادی ضروری تھی لیکن وہ پہلی کو بھی کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بیک وقت دو بیویوں کے شوہر کہلوانا چاہتے تھے۔''

> ''مردوں کی چار چار شادیاں بھی ہوتی ہیں۔انہوں نے دہائی دی مگر وہ (سسرال والے) نہ مانے۔انہوں نے مجبوراً پہلی بیوی کو طلاق دے کر رخصت کر دیا۔''

''باتوں ہی باتوں میں مہمان عورت نے انہیں اطلاع بہم پہنچائی کہ ان کی مطلقہ بیوی نے اپنے نئے شوہر کے ہاں دو جڑواں بچوں کو جنم دیا ہے۔ یہ خبر سن کر مولوی صاحب دل ہی دل میں کڑھنے لگے۔ ''کم بخت نے میرے ہاں دو سالوں میں ایک بھی نہ جنا اور اب وہاں سال کے اندر ہی دو دو بچوں کو جنم دے ڈالا۔'' (عبرت)

شمس الرحمن فاروقی شولز اور کلاگ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کردار نگاری کا سب سے اہم عنصر وہی ہے جسے کردار کی داخلی زندگی کہتے ہیں۔ یہ عنصر جتنا کم ہوگا، فن پارے کی تعمیر میں دوسرے بیانیہ عناصر مثلاً پلاٹ، حالات کا بیان، دوسرے واقعات کے حوالے اور بدیعیات Rhetoric کا حصہ زیادہ ہوگا۔ کامیاب بیانیہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس میں داخلی زندگی پر زور دیا جائے اور اسے تفصیل سے پیش کیا جائے۔ لیکن اسے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے دوسرے عناصر کا استعمال کرنا ہوتا ہے، اگر اسے خود کو انسانی دلچسپی کی چیز کی حیثیت سے باقی رکھنا منظور ہو۔ یونانی، داستانی قصوں میں یہ کمی پیچیدہ پلاٹ، محاکاتی بیان اور صنائع بدائع سے بھرپور بدیعیات سے پوری کی جاتی تھیں۔ یہی حال سولہویں اور سترہویں صدی کے انگریزی اور فرانسیسی داستانی قصہ گویوں کا ہے جو یونانیوں کے متبع تھے۔''

(بحوالہ نیا اردو افسانہ، از گوپی چند نارنگ، ص ۲۲۹، ۲۲۸)

زنفر کھوکھر کے افسانوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جنہیں اوپر بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جو جدید موضوعات اور ان سے وابستہ مسائل بیان کیے ہیں، ان میں بھی کردار، مکالمہ اور منظر کا باہمی توازن ان کے فن کے استحکام کی دلیل ہے۔ افسانہ ''بے ایمان'' میں آج کل کی نئی ایجاد کے کیمروں کے حوالے سے جدید تر ٹکنالوجی کے فائدے اور نقصان کا خاکہ انہوں نے کھینچا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی ذہن عہد حاضر کے جدید تر موضوعات پر کتنا سنجیدہ ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''یہ کیمرہ ہے کہ شیطان۔''

وہ اپنے رجسٹر پر جھکے ہوئے مزید سخت مگر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''تم نادان شخص خواہ مخواہ ہی مجھے پھنسانے جا رہے ہو۔ جانتے نہیں کہ آج کل سرکار اپنے ملازموں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے اور ہر طرح کی سختی برت رہی ہے اور میں اس وقت اپنے سرکاری دفتر میں ہوں۔ یہاں بیسیوں لوگ اور بھی موجود ہیں۔ میری ملازمت جاتی رہے گی۔ تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا۔''

''بے ایمان کہیں کا!'' اس نے اسے ایک زوردار گالی دی۔

مگر یہ کیمرہ آخر اس کے پاس تھا کہاں؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''اور یہ کیا کیمرہ ہے جو نظر بھی نہیں آتا ہے۔ یہ کیمرہ ہے کہ شیطان؟''

اس کے اندر سے ایک سوال ابھرا۔

اور پھر اگلے ہی لمحے اپنے اندر سے ہی اسے اس کا جواب بھی مل گیا۔

''یہ اکیسویں صدی کا انسان ہے۔'' (بے ایمان)

زنفر کھوکھر نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری کی کچھ ایسی سطحیں بھی ابھاری ہیں جو ہمارے دل و ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ان میں سے ایک افسانہ ''تین وارداتیں'' ہیں جو کہ محض عنوان کے اعتبار سے ۳ وارداتیں میں پہلی واردات، دوسری واردات اور تیسری واردات کا عنوان کس لیے دیا گیا ہے۔ یہ تو زنفر کھوکھر ہی جانیں لیکن تینوں عنوان نہ بھی ہوتے تو افسانے کی خصوصیت پر فرق نہ پڑتا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا کہ مرکزی عنوان ''تین وارداتیں'' ضرور تبدیل کرنا پڑتا۔ بہر حال میں اسے زنفر کھوکھر کا بہت کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ مسئلہ جموں و کشمیر کے تعلق سے یہ خود میں منفرد افسانہ ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ افسانہ کچھ اس قسم کی حقیقتوں کو سامنے لاتا ہے کہ ان کی ذہانت پر رشک آتا ہے۔ اس افسانے کی بھی چند سطریں دیکھی جائیں۔

> ''زمین کے تنازعے کو لے کر تینوں بھائی یکایک ہی لڑ پڑے۔ دو کے مقابل میں ایک بھائی لڑتے بھڑتے سر میں پتھر کی چوٹ کھا کر ڈھیر ہو گیا۔''
>
> یہ ہمیں ایک لاکھ روپئے دے کر جا رہا ہے۔
>
> ''مگر کہاں سے؟ اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔ لاکھ روپئے کا مالک ہوتا تو اس کی بیوی گھر چھوڑ کر کیوں بھاگتی۔''

''اب سرکار دے گی ہمیں۔ یہ ملٹینسی ہمارے اور کس کام
آئے گی۔''

(پہلی واردات)

''صبح ہوئی تو خبر پھیلی کہ رات کی فائرنگ میں تین دہشت پسند
مارے گئے جبکہ دیگر کئی بھاگ نکلے۔''

(دوسری واردات)

''بے گناہ سیویلین کی ہلاکتوں پر مقامی لوگ مشتعل ہوکر
سڑک تک پہنچ آئے۔ نعرہ بازی ہوئی۔ ٹریفک جام ہوا۔ پہلے لاٹھیاں
چلیں پھر فائرنگ ہوئی۔ پانچ لوگ زخمی ہوئے ایک ہلاک ہوا۔ تب کہیں
جا کر ٹریفک بحال ہوا۔''

(تیسری واردات)

اس طرح کے کئی افسانے ہیں مثلاً 'کب تلک، خیرات، دو حکمران غیرہ جن میں زنفر کھوکھر کی تخلیقی صلاحیت نے اردو کے افسانوی ادب میں بہترین افسانوں کا اضافہ کیا ہے۔ کسی کسی افسانے کی بے جا طوالت بھی کھٹکتی ہے مثلاً 'عبرت، وہ کون تھا' اور 'دہشت کا سماں'۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اگر ان افسانوں کے کچھ اقتباسات کم ہوتے اور مختصر لفظوں میں زیادہ بات کہنے کے فن کو کام میں لایا جاتا تو یہ اور بھی عمدہ ہو سکتے تھے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ زنفر کھوکھر افسانوی فن کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں اور اردو افسانوی ادب میں اپنے بہترین افسانوی ادب کا اضافہ کر رہی ہیں۔

نمونۂ تحریر

تین وارداتیں

پہلی واردات:

زمین کے تنازعے کو لے کر تینوں بھائی یکایک ہی لڑ پڑے۔ دو کے مقابلے میں ایک بھائی لڑتے بھڑتے سر میں پتھر کی چوٹ کھا کر ڈھیر ہو گیا۔

''اوہ! میں تو اسے ڈرا رہا تھا، مگر یہ تو مرنے لگا ہے۔ ذرا دیکھو تو!''

''ارے ہاں! یہ تو مر گیا۔ اب کیا ہوگا؟''

''اچھا ہوا۔ اس کی حصہ داری سے ہماری جان تو چھوٹی۔''

''مگر ہم جیل میں بند بھی رہیں گے؟''

''ہرگز نہیں!''

''وہ کیسے؟''

''یہ ہمیں ایک لاکھ روپے دے کر جا رہا ہے۔''

''مگر کہاں سے؟ اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔ لاکھ روپے کا مالک ہوتا تو اس کی بیوی گھر چھوڑ کر کیوں بھاگتی۔''

''ابے، سرکار دے گی ہمیں۔ یہ ملی ٹینسی ہمارے اور کس کام آئے گی۔''

''واہ! اب میں سمجھ گیا۔ بڑا دھنی نکلا ہے یہ۔ اپنے حصے کی زمین کے ساتھ ساتھ ایک لاکھ بھی دے کر جا رہا ہے۔ آخر اپنا بھائی ہی تو ہے۔۔۔۔۔۔۔ بھلے ہی الگ ماں سے ہے۔''

''بس بس، زیادہ خوشی نہ منا۔ جلدی سے چھری، چاقو کا بندوبست کر۔''

''وہ کس لیے؟''

''مخبری کرنے والوں کے گلے کاٹے جاتے ہیں۔ ان پر گولیاں ضائع نہیں کی جاتی ہیں۔''

''ارے ہاں! مگر یہاں کھیت میں چھری چاقو کہاں؟ درانتی ہے درانتی، جو میں گھاس کاٹنے کے لیے ساتھ لایا تھا۔''

''جلدی سے لے آ۔۔۔۔۔!''

''یہ دیکھو۔ کچھ خون بھی بہہ نکلا ہے۔''

''اب۔۔۔۔۔؟''

''اب لاش پر گھاس پھوس ڈال کر دور ہٹ جاتے ہیں اور رات کے وقت یہاں سے اٹھا کر نالے کے اس پار سڑک کے کنارے پھینک آئیں گے۔ مگر دیکھو کوئی ہمیں کہیں سے دیکھ تو نہیں رہا ہے؟''

''یہاں تو دور دور تک بھی کوئی نہیں ہے، مگر کہیں سے کوئی ہمارا عینی گواہ نکل آیا تو۔۔۔۔۔؟''

''تو بھی فکر کی بات نہیں۔ ایک لاکھ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لاکھ میں سے صرف چند ہزار دے کر اس کا منھ بند کر دیں گے۔''

''واہ! بہت ہوشیار اور دماغ والے ہو۔ کاش تم پڑھے لکھے بھی ہوتے تو تمہاری قابلیت کی کوئی حد نہ ہوتی۔''

''ارے ہاں، یاد آیا۔ لاش کے پاس ایک رقعہ بھی رکھنا پڑے گا۔ کیا تم لکھ سکو گے۔۔۔۔؟''

''ہاں! ٹیڑھی میڑھی چند سطریں لکھ ہی لوں گا۔ آخر پانچ جماعتیں اسکول میں پڑھا ہوں۔''

دوسری واردات: علاقے میں پھیلی ملی ٹنسی کی روک تھام کے لیے رات کے وقت گشت پر نکلی گشتی پارٹی نے علاقے میں نقل وحرکت دیکھی اور چوکس ہوگئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ رات کے سناٹے میں چلنے والی گولیوں کی آوازیں سن کر اپنے گھروں اور بستروں میں سوئے ہوئے لوگوں کے جسم تھر تھرا اٹھے۔

صبح ہوئی تو خبر پھیلی کہ رات کی فائرنگ میں تین دہشت پسند مارے گئے جب کہ دیگر کئی بھاگ نکلے۔ ان کو پکڑنے کے لیے آرمی نے سارے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا، گھر گھر تلاشی ہو رہی ہے۔

کچھ ہی دیر کے بعد پولیس مارے گئے دہشت پسندوں کی لاشیں اٹھوانے کے لیے کچھ سیویلین کو ساتھ لے کر جائے واردات پر پہنچی اور لوگوں نے دیکھا اور پہچانا کہ مارے جانے والے تو اسی گاؤں کے رہنے والے تینوں بھائی ہیں۔

پولیس نے پنچ نامہ میں ایک حیرت کن انکشاف کیا کہ تینوں لاشوں میں سے ایک کا گلا

کند
ہتھیار سے کٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر گولیاں لگنے کے نشانات تھے مگر خون نہیں نکلا تھا، جبکہ دو لاشیں خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔

تیسری واردات: بے گناہ سیویلین کی ہلاکتوں پر مقامی لوگ مشتعل ہو کر سڑک تک پہنچ آئے۔ نعرہ بازی ہوئی۔ ٹریفک جام ہوا۔ پہلے لاٹھیاں چلیں، پھر فائرنگ ہوئی۔ پانچ لوگ زخمی ہوئے، ایک اور ہلاک ہوا۔ تب کہیں جا کر ٹریفک بحال ہوا۔

نمونۂ کلام

نام: شیخ سجاد حسین

قلمی نام: سجاد پونچھی

پیدائش: ۱۰، دسمبر ۱۹۴۶ء

تعلیم: ایم۔ایس۔سی (جغرافیہ)

پیشہ: ریٹائرڈ وارڈن، گجر ہاسٹل

تصانیف: فصلیں بولتی ہیں (شعری مجموعہ)

سمندر آشنا (شعری مجموعہ)

پتہ: 338 Julaha Ka Mohalla

Jammu-

موبائل: 9419104353

غزل

غم حیات کی تفسیر اس میں رہنے دو
یہ گھر ہے زخموں کا، ہر تیر اس میں رہنے دو

ازل سے عشق تو اس کی جفا کا عادی ہے
یہ جور و کرب کی شمشیر اس میں رہنے دو

یہ کس کے کرب کی آواز اس میں اٹھتی ہے
یہ نیم باز خلش تیر اس میں رہنے دو

دعا بہار کی مانگی تھی اس کے درپن سے
بکھر کے ٹکڑوں کی تصویر اس میں رہنے دو

عجب شعور کی منزل ہے اس کے شعروں میں
غموں کے فصل کی تقریر اس میں رہنے دو

سجاد ،عشق کی سوغات زہر ہوتی ہے
کہ تلخ جام کی اکسیر اس میں رہنے دو

سجاد پونچھی

سجاد پونچھی کے یہاں حقیقت بیانی کی جو ایک انتخابی نظر ہے، اس کا رشتہ فن کے جمالیاتی تقاضوں سے منسلک اور مستحکم ہے۔ اس استحکام کی بنیاد ان کے ذاتی تجربات ہیں جو ان کے مشاہدات کے عطا کردہ ہیں۔ انہوں نے انسانی عمل کے ان نقاط کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے جنہیں لازمی طور پر فنی اظہار کی اساس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چند اشعار

یہ مانا بے بسی میں ہر بشر خاموش رہتا ہے
مگر کب تک دبانے سے ہنر خاموش رہتا ہے

اسیروں کی حمایت میں تعجب ہے ہمیں سجاد
فصیلیں بولتی ہیں اور نگر خاموش رہتا ہے

اس واسطے بھی روح میری دل شکن نہ تھی
جو ربط جسم سے تھا اسے ٹوٹنا ہی تھا

یہ کس وادی میں آخر آ گئے ہم
یہاں جو لاش ہے، وہ بے کفن ہے

سب حشر اٹھاتی ہے یہ کچھ کہہ نہیں سکتے
بگڑی ہوئی کچھ ایسی زمانے کی ہوا ہے

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ سجاد پونچھی عقلیت کے منفی اثرات کے اظہار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی تخلیقی فکر کو جذبات کے انہیں دھاروں سے زیادہ تر منسلک

رکھتے ہیں۔ یہ امر شعوری ہے کہ لاشعوری اس متعلق انہوں نے اپنے ایک شعر میں نتیجہ قارئین کے سپرد کردیا ہے کہ وہ جو چاہیں نتیجہ اخذ کریں۔ وہ شعر یہ ہے ؎

گذارا ہے مجھے اس زندگی نے کن مراحل سے
اسے میں کربلا یا وادیٔ کشمیر کیا لکھوں؟

ظاہر ہے کہ کربلا یہاں علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے لیکن وادیٔ کشمیر کو بھی اس علامت کے مماثل قرار دینا ظلم و جبر کی اس شدت احساس کا آئینہ دار ہے جو شعوری یا لاشعوری طور پر شاعر کے مشاہدے کا اہم عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سجاد پونچھی نے مادہ پرستی اور روحانیت دونوں سے تخلیقی رشتہ استوار کر کے ان دونوں منتہاؤں کو ایک کلی حقیقت کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی ہے ؎

نگاہ غور سے وہ دیکھ کر خاموش رہتے ہیں
کوئی منظر بھی ہو، اہل نظر خاموش رہتے ہیں

جس کی یہ زندگی ہے چند اصولوں پہ ٹکی
لازماً وقت کی آنکھوں میں کھٹکتا ہوگا

یہ زندگی ہے تو رنج و الم بھی لازم ہیں
ذرا سی رات ضروری ہے، ہر سحر کے لیے

یہ لوگ جس کو محبت کا دور کہتے ہیں
کہاں سے لائے گی اب گردش زمانہ وہ

آج کے دور میں یہ بات ہے ممکن ورنہ
کھوٹا سکہ بھی زمانے میں کہاں چلتا ہے

سجاد پونچھی کے یہاں آفاقی قدروں اور آفاقی اصولوں کے ساتھ مقامی، تہذیبی اور

ثقافتی قدروں کی بازیافت کے بھی اشارے ملتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے میر کی شاعری کے مطالعے کے ضمن میں غزل کی شعریات کی بازیافت کے تعلق سے لکھا ہے:

''گذشتہ سو برسوں سے ہمارا المیہ یہ رہا ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے ادب کو غیر تہذیب کے حوالے سے پڑھا، اور اس وقت یہ عالم ہے کہ وہ شعریات ہی ہم سے کھوگئی جس کی رو سے کلاسکی زمانے کے لوگ اپنے شعر بناتے تھے۔ لہٰذا کلاسکی شاعری کا بڑا حصہ ہمارے لیے بے معنی ہے اور جو حصہ معنی خیز ہے، وہ بھی اسی لیے با معنی ہے کہ غیر تہذیب کے تصورات کو ہم کھینچ تان کر اس پر منطبق کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ کسی ادب کو پڑھنے کے لیے آفاقی تنقیدی اصولوں سے زیادہ ضروری اس بات کا جاننا ہے کہ جس تہذیب نے وہ ادب پیدا کیا ہے اس میں کس چیز کو ادب کہتے ہیں۔ کیونکہ آخری تجزیے میں بس یہی بات نکلتی ہے کہ جن متون کو ادبی معاشرہ ادب کہے وہ ادب ہیں، جن کو ادبی معاشرہ اچھا کہے وہ اچھا ادب ہیں اور جن کو ادبی معاشرہ بڑا ادب کہے وہ بڑا ادب ہیں۔''

(بحوالہ معاصر تنقیدی رویے، ابوالکلام قاسمی، ص ۴۹، ۴۸)

سجاد پونچھی کے ایک شعر کا حوالہ میں اوپر دے چکا ہوں جس میں شمس الرحمن فاروقی کی بیان کردہ تہذیب کا عکس تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے دوسرے اشعار بھی اپنی مقامی تہذیب سے پیدا ہونے والے ادب کی بہترین نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے آگے کی دنیا کو بھی اپنے مفہوم و معنی میں سمیٹ لیتے ہیں۔

ان میں خود اعتمادی کا جذبہ نہ تھا
زندگی بھر جو راہیں بدلتے رہے

بات بگڑی خرد کے ہاتھوں سے
ہم جنوں میں سنور گئے ہوتے

جنہیں اپنی مٹی گوارہ نہ تھی
وہ مرمر کے آخر پھسلتے رہے

سجاد پونچھی اپنے تخلیقی ذہن کو موجودہ عہد کے عقلی معیاروں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے جس نتیجے پر پہنچتے ہیں، مندرجہ ذیل دو اشعار سے اس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

وقار زندگی کا میں ہوں قائل
میں ہر شئے میں قرینہ چاہتا ہوں

ہمیں تو اصل کی جانب پلٹنا تھا سجاد
لچکتی شاخ پہ ہم آشیاں بناتے رہے

یقیناً ایک حساس ادیب زندگی میں وقار اور ہر شئے میں قرینے کا خواہش مند ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ زندگی کا اعلیٰ معیار متعین کرنے میں معاون ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے جو زندگی کے اصول اپنانے پڑتے ہیں، آج کا تقریباً پورا معاشرہ اس سے خالی ہے۔ کیونکہ لچکتی شاخ پر آشیانہ بنانے پر آشیانہ میں پائداری نہیں رہتی۔ اس لیے سجاد پونچھی پرانے وقتوں کی جانب پلٹ جانے کی خواہش کرتے ہیں جو ممکن نہیں ہے۔ شاید اسی لیے ان کے یہاں اس نوعیت کے اشعار ملتے ہیں جو سماجی حقیقت کے ساتھ ساتھ ادبی حقیقت کے بھی آئینہ دار ہیں۔

نام: غلام نبی نائیک

قلمی نام: شہباز راجوروی

ولدیت: عبدالسبحان نائیک

پیدائش: ۲۴،فروری ۱۹۴۰ء

تعلیم: ایم۔اے

تصانیف: ژہینہ گمنۂ آواز

براٹھتی

پوشہ،پوشہ،طواف (کشمیری مجموعے)

لمحے لمحے (اردو شعری مجموعہ)

انداز نظر (اردو نثر)

خاب سولے (پہاڑی)

پیشہ: لکچرار (ریٹائرڈ)

اعزازات: ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ

کلچرل اکیڈمی ایوارڈ

پتہ: Bahrot,Rajouri

موبائل:

نمونہ کلام

غزل

نسیم صبح کو یارا نہ ہوگا
زمین گل ! کبھی سوچا نہ ہوگا

سمندر جس کو دے خیرات میں پیاس
اسے تو دشت سے شکوہ نہ ہوگا

وہی حالات کا صحرا ،مسافر
یہاں تو خضر بھی اترا نہ ہوگا

مصر اظہار پر ہو شام احساس
سحر کے کرب میں سویا نہ ہوگا

مکینوں کا لہو ارزاں ہو شہباز
مکاں بھی درد میں رویا نہ ہوگا

شاہباز راجوروی

شاہباز راجوروی کے یہاں روایتی شاعری کی وہ خصوصیات دریافت کی جاسکتی ہیں جہاں سکون بھی ہے، اضطراب بھی اور سکوت وشور کی آمیزش بھی۔ ان کے یہاں نئے جہانوں کی دریافت کا عمل تو نظر نہیں آتا لیکن روایت کے مستحکم عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ الفاظ کے انتخاب کا معاملہ ہو یا پھر اسے برتنے کا طرز یا پھر موضوعات کا میدان، ہر جگہ روایت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ چند اشعار ذیل میں درج ہیں ؎

طواف شمع پروانے کی معراج
نیاز عاشقانہ جانتا ہے

ہم ہیں اپنے وجود کے منکر
بولتی ہے کتاب آنگن میں

مجھے رکھتا ہے خائف حادثوں سے
وہ میرا آب و دانہ جانتا ہے

زندگی کچھ چاند سے خوابوں کو دی
بے کفن لاشوں کی عظمت پوچھنا

مندرجہ بالا اشعار میں ۳/اشعار (۲، ۳اور ۵) جدید طرز کے حامل ہیں۔ کوئی بھی ان کو آج کے عہد کے لفظی برتاؤ اور لہجے سے تعبیر کرسکتا ہے۔ تو پھر جو میں نے اوپر عرض کیا کہ ان کے یہاں نئے جہانوں کی دریافت کا عمل نظر نہیں آتا، اس کا کیا مطلب ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار جن میں جدید لب ولہجے کی جھلک نظر آتی ہے، ان کو روایت اور جدید کے درمیان کی

کڑی کہا جا سکتا ہے۔ ایسی کڑی جس کی لمبائی ۱۰۰ سے زائد برسوں پر محیط ہے اور جو برابر آنے والے عہد کے لیے امکانات کے راستوں کو ہموار کرتی رہی ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

خون بھی آئے گا تو آنکھوں سے
ایک سیل بہار نکلے گا

اگر کسی کو علم نہ ہو کہ یہ شعر خدائے سخن میر تقی میر کا ہے تو وہ شاید اس شعر کے میر کا ہونے کا تصور بھی نہ کرے، تو اس دلیل کی روشنی میں میرا یہ معروضہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں روایت کے مستحکم عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہباز راجوروی کے یہ اشعار ۲۰۰۵ کے بعد کے تخلیق کردہ ہیں اور ضعیف العمری اور دور افتادہ، پس ماندہ علاقے میں رہنے کے باوجود بقول شاعر ؎

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

والا معاملہ ان کے ساتھ ہے۔ اس لیے ان کے اشعار میں اس قسم کے جدید روایتی لہجے کا در آنا ناممکنات میں نہیں۔ مزید اشعار دیکھے جائیں ؎

بیاض ہستی سجا رہا ہے
وہ لفظ لکھ کر مٹا رہا ہے

عجب انداز تیرا شہر ہستی
یہاں ہر شئے میں اک عالم چھپا ہے

سبھی ہوں حاشیوں پر مطمئن جب
کوئی شاہباز پھر منزل نہیں ہے

چمکتا ہے گھنے بادل ہٹا کر!
سفر سورج کا ہیجانی نہیں ہے

دلوں میں درد اور لب پر دعا ہو
ہماری بستیوں میں بھی خدا ہو

شمس الرحمن فاروقی نے اپنی کتاب ''شعریات'' میں شاعرانہ صداقت اور تاریخی صداقت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعر کا تفاعل یہ نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کو بیان کرے جو واقع ہو چکی ہیں، دراصل اس کا تفاعل ان چیزوں کو بیان کرنا ہے جو واقع ہو سکتی ہیں۔ یعنی جن کا واقع ہونا قانون الزوم یا قانون احتمال کی روشنی میں ممکن ہے۔ شاعر اور مورخ میں فرق یہ نہیں ہے کہ ایک نظم میں اظہار خیال کرتا ہے اور دوسرا نثر میں۔ ہیروڈوٹس کی تصنیفات کو اگر منظوم کر دیا جائے تو بھی جس طرح وزن و بحر سے معرا صورت میں وہ تاریخ تھیں، اس طرح وزن و بحر کے التزام کے باوجود وہ تاریخ کی ہی ایک صنف شمار ہوں گی۔ اصل فرق یہ ہے کہ مورخ صرف وہی باتیں لکھتا ہے جو ہو چکیں اور شاعر ان باتوں کا ذکر کرتا ہے جو واقع ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا شاعری تاریخ سے بلند تر اور زیادہ فلسفیانہ چیز ہے کیونکہ شاعری ان چیزوں کے اظہار کی طرف جھکتی ہے جو آفاقی ہیں، جبکہ تاریخ کو صرف مخصوص حقائق سے علاقہ ہوتا ہے۔''

(شعریات، شمس الرحمن فاروقی۔ ص ۷۳)

ظاہر ہے کہ شمس الرحمن فاروقی کا مندرجہ بالا بیان شاعری کے مجموعی ادوار کا احاطہ کرتا ہے اور اسے کسی خاص دور، تحریک یا رجحان سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شاعری میں اپنے عہد کے حالات کا اظہار تاریخ سے مختلف اور اعلیٰ معیار کا تقاضا کرتا ہے۔ اور حساس شاعر اس تقاضے پر پورا اترتا ہے۔ شاہباز راجوروی نے اپنے عہد اور آنے والے عہد کے متعلق جو شبہات ظاہر کیے ہیں اور ان سے جو نتائج اخذ کیے ہیں، وہ شاعرانہ صداقت پر مبنی ہے۔

ہم ہیں شاہباز کیا قیامت لوگ؟
لطف آتا ہے گھر جلانے میں

ہم ہیں آوارہ نظری کے شہنشاہ
یہی بے مائیگی شہر جنوں کی
وقت فیصل ہے، اس پہ کیا بحثیں
صرف اپنا جواز لکھنا ہے

شاہباز راجوروی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ آج کے عہد میں فن کی قدر و قیمت کا تعین کافی حد تک سماج کی عمومی ترقی کے نشیب و فراز سے منسلک ہو گیا ہے یا کر دیا گیا ہے۔ فن جہاں ذاتی یا سماجی جانب دارانہ مفاد کی ترویج و اشاعت میں معاون ہوتا ہے، اسے عام مقبولیت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں فن اپنی خالص ادبی سطح پر اس قسم کے راستے استوار نہیں کر پاتا، اسے عمومی سطح پر وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو تعقل کا ساتھ دے سکے۔ ایسی فنی تعبیروں سے جہاں ادبی وقار پر حرف آتا ہے، وہیں سماجی اقدار بھی متاثر ہوتے ہیں۔

تو اس طرح گویا معاشرے کی پیچیدگیوں اور الجھاؤں کا ایک سبب خالص ادبی اقدار اور فن کی خالص ادب سے دوری بھی سمجھ میں آتا ہے۔ شاہباز راجوروی نے روایت اور کلاسک میں برتے جانے والے ہر قسم کے اسالیب اور موضوعات کی وسعت کو اپنے شعری ذہن کا مرکز و محور بناتے ہوئے ان نارسائیوں پر کہ جن کا تعلق زندگی سے ہے، پر اپنے خیالات کا اظہار بہت عمدہ طریقے سے کیا ہے۔

میرے اندر ہے لوح بے تحریر
وقت دے، اسم ذات لکھنے دے

سمندر جس کو دے خیرات میں پیاس
اسے تو دشت سے شکوہ نہ ہوگا

خدا کے فیصلے پر دسترس کیا
میں عقل نارسا کو بیچتا ہوں

شاہباز راجوروی عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں یادِ الٰہی اور مکمل آرام کے علاوہ کوئی اور مشغلہ اختیار کرنا اور وہ بھی دنیا کے سب سے مشکل کام یعنی تفکر اور پھر اس کو تخلیقی عمل کا جامہ پہنانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کا یہ ادبی تخلیقی حوصلہ بنائے رکھے۔

نام: ڈاکٹر شاہنواز چودھری

ولدیت: چودھری صغیر حسین

پیدائش: ۲، مئی ۱۹۷۷ء نکہ منجھاڑی، مہنڈر

تصانیف: اقبال اور عصر حاضر

اردو آبجکٹیو

عالمی صحافت

مادہ پرستی اور انسانی قدروں کی تذلیل

روح شمس الدین

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ذریعۂ اظہار: اردو، گوجری

پتہ: Culturel Academy Jammu And Kashmir Canal Road,Jammu, Lal Mandi Srinagar

ڈاکٹر شاہنواز چودھری

تصورات اقبال ڈاکٹر شاہنواز کی اقبال شناسی کے تعلق سے بڑی اہم کتاب ہے۔اس میں انہوں نے اقبال کی شاعری کے بیش تر گوشوں کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔(ا) ڈاکٹر شاہنواز کے تحریر کردہ مضامین جن کی فہرست درج زیل ہے۔

ا۔شجرہ نسب

۲۔حیات اقبال

۳۔اقبال اور اس کا عہد

۴۔اقبال کی چنندہ نظموں کے تجزیات

۵۔اقبال کا تصور جمال

۶۔اقبال اور تصوف

۷۔اقبال اور بانگ درا

۸۔اقبال اور بال جبرئیل

۹۔اقبال اور ضرب کلیم

۱۰۔اقبال اور ارمغان حجاز

حصہ دوم میں ڈاکٹر شاہنواز نے دیگر تخلیق کاروں کے اقبال کے متعلق اہم مضامین کو اپنی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ان کی فہرست یہ ہے۔

ا۔اقبال کا شعری تصور۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر یوسف حسین خان

۲۔اقبال کا تصور عشق۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

۳۔اقبال کی عقل پر تنقید۔۔۔۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

۴۔قلمی ہنگامہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر جاوید اقبال

''اقبال کی غزل گوئی'' نامی ایک باب میں ڈاکٹر شاہنواز نے لکھا ہے۔

''علامہ اقبال کی غزل گوئی ،ان کی نظم نگاری کے مقابلے میں اتنی جان دار نہیں ہے لیکن اقبال نے جو بھی غزلیں کہی ہیں وہ ایک بڑے سے بڑے غزل گو کے بس کی بات نہیں ہے۔شاعری میں شروع شروع اصلاح داغ سے لیتے تھے لیکن بہت جلد داغ سے اصلاح لینا چھوڑ دی۔بعض حقائق کے مطابق داغ نے علامہ اقبال کو لکھا کہ۔'آپ مجھے اپنا کلام برائے اصلاح نہ بھیجا کریں کیوں کہ اس میں اصلاح کی بہت کم گنجائش ہے،اس کے بعد علامہ اقبال نے اپنا کلام داغ کو نہ بھیجا۔علامہ اقبال نے جتنی بھی غزلیں لکھی ہیں،ان پر داغ کا رنگ غالب ہے۔بعض اوقات یہ شائبہ ہوتا ہے کہ یہ شعر اقبال کا ہے کہ داغ کا۔مثال کے طور پر علامہ اقبال کے وہ اشعار دیکھئے جو داغ کے رنگ میں ہیں۔''

دلیل کے طور پر انہوں نے جو اشعار تحریر کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

''نہ آئے ہمیں اس اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی''

ڈاکٹر شاہنواز صاحب کے مطابق اقبال کی غزلیں ان کی نظموں سے کم جان دار ہونے کے باوجود اتنی اہلیت رکھتی ہیں کہ دوسرے بڑے سے بڑے غزل گو اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے ،میرے خیال میں اقبال کی محبت میں سرشار ایک جذباتی فیصلہ ہے۔اور غور کیا جائے تو جب ان کی کم جاندار غزلوں کا یہ حال ہے تو ان کی نظموں کا جو بھی معیار قائم کیا جائے گا اس پر تو کسی اردو نظم گو کی تخلیقات کا دور دور سے گذر بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے۔جمشید جہاں آرا نے اپنے مضمون 'اردو غزل میں اقبال کا کارنامہ' مطبوعہ اقبالیات شمارہ ۲۲۔اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی، کشمیر یونیورسٹی ص ۲۷۲ تا ۲۷۷ میں اقبال کی غزل کے تعلق سے جو حوالے درج کئے ہیں، ان میں ایک عبادت بریلوی کا ہے۔

''غزل میں قافیہ پیمائی کا خیال رخصت ہوا اور اس کی جگہ حقیقت و واقعیت نے لے لی۔تقلید جواب تک غزل میں کسی نہ کسی طرح رونما ہوئی تھی، اس کا خاتمہ ہوا ہے اور اس کی جگہ خلوص اور صداقت کے عنصر رونما ہوئے ہیں''

(غزل اور مطالعہ غزل ۱۹۷۴ء ص ۴۰۷)۔

ماہرالقادری کے مضمون ''اقبال کی شاعری'' کے حوالے سے درج ہے۔

''فلسفے کے مطالبوں اور شعر کے تقاضوں کو ایک دوسرے میں سمودینا ایک طرح کی جادوگری ہے۔۔۔۔ستاروں کو توڑ کر ان سے آفتاب تراش لینا اور فلسفے کے سنگ و آہن میں گداز پیدا

کر کے ان سے گل بوٹے بنانا ، یہ کرامت علامہ اقبال نے دکھائی ہے۔''

(اقبال بحیثیت شاعر ، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ، ۱۹۷۷ ص ۳۸۳)

ڈاکٹر وقار رضوی کے حوالے سے درج ہے۔

''ان کی غزلوں میں جوش و ولولہ ہے۔اقبال کی غزلوں میں پہاڑوں کا شکوہ، آسمانوں کی بلندی ہے۔ان کی غزل نہنگوں سے پنجہ لڑانا اور طوفان سے مقابلہ کرنا سکھاتی ہے۔'

(تاریخ جدید اردو غزل۔ ۱۹۸۸،ص۔ ۵۱۴)

اس قسم کے اور بھی بیانات دیگر کتابوں سے درج کئے جاسکتے ہیں۔غور طلب معاملہ یہ ہے کہ ان تمام حوالوں کی روشنی میں ڈاکٹر شاہنواز صاحب کے مندرجہ بالا بیان کو تقویت نہیں ملتی ،اقبال یقیناً بہت عمدہ غزل کے شاعر تھے لیکن اپنی غزلیہ شاعری کے بل پر وہ میر، غالب یا پھر جدید غزل میں بانی یا محمد علوی، عرفان صدیقی وغیرہ سے اتنے آگے تھے کہ ان کے معیار کی غزلیں کہنا ان کے بس کی بھی بات نہ ہو، اس کو محبت کی شدید جذباتی کیفیت کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔دوسری بات انہوں نے یہ لکھی کہ اقبال جنہوں نے شروع شروع میں اصلاح داغ سے لی ،ازخود اصلاح لینا چھوڑ دی۔ کیوں کہ آگے انہوں نے ان حقائق کو بعض حقائق کے زمرے میں رکھا ہے جس کے مطابق داغ نے خود انہیں لکھا کہ وہ اب ان کو کلام نہ دکھائیں۔ میں نے آج تک جو بھی پڑھا ہے اس میں تو یہی استناد ہے کہ داغ نے خود اقبال کو اصلاح نہ لینے کے متعلق خط لکھا تھا۔اقبال نے خود کو استاد مانتے ہوئے جیسا کہ شاہنواز صاحب کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے، خود ہی داغ سے اصلاح لینا ترک کر دیا تھا، اس طرح کی کوئی مستند تحریر آج تک میری نظر سے تو نہیں گذری۔ تیسری بات جو شاہنواز صاحب نے عرض کی کہ اقبال نے جتنی بھی غزلیں لکھی ان پر داغ

کا رنگ نمایاں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان غزلوں میں جتنے بھی اشعار ہیں، ان پر داغ کا اثر ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر ان غزلیہ اشعار کا کیا ہو گا جن کو اقبال کی اپنی ایجاد کہا جاتا ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ

میری نوائے شوق سے، شورے حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں، بت کدۂ صفات میں

اگر کجرو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

مٹا دیا مرے ساقی نے امتیاز من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الہٰ الا ہو

باغ بہشت سے مجھے، حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر

اس قسم کے اور بھی اشعار تلاش کئے جا سکتے ہیں جن کو خالص اقبال کی اپنی اختراع کہا جاتا ہے اور ان پر داغ کے کلام کے رنگ کا اثر میرے خیال میں دور دور تک محسوس نہیں کیا جا سکتا ۔اقبال کا ایک اور شعر ہے۔

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

غالب کا شعر ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

غور کیا جائے تو مرکزی خیال ایک ہے۔لیکن اس کے لئے اقبال نے اگر اثر لیا ہوگا تو غالب سے لیا ہوگا، داغ سے نہیں۔لیکن اقبال کے فن کی تعریف انہوں نے بہت عمدہ الفاظ میں کی ہے۔لکھتے ہیں۔

''اقبال کائنات کا بھنورا تھا۔اس نے اس طرح سے دنیا کے مذاہب اور فلسفوں کا رس چوس لیا تھا،جس طرح بھنورا پھولوں کے گرد گھوم گھوم کر چوستا ہے۔''

تعریف اور اس کے پس منظر میں انہوں نے اقبال کی علمی انفرادیت کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ قابل صد تحسین ہی نہیں، قابل تقلید بھی ہے۔یہاں شکیل ارحمٰن صاحب کے اقبال کے متعلق الفاظ یاد آتے ہیں۔وہ اقبال اور تصوف کی جمالیات میں لکھے ہیں۔

''محمد اقبال کے نزدیک مذہب صرف خیال، احساس یا عمل کا نام نہیں ہے بلکہ ''پورے انسان'' کے اظہار کا نام ہے۔وہ خیال ،تصور اور وجدان کی تقسیم کے قائل نہیں ہیں، ان کے نزدیک دونوں ایک ہی سر چشمے کی نعمتیں ہیں۔''

(تصوف کی جمالیات، از۔شکیل ارحمٰن۔ص۔۲۱۹)

ڈاکٹر شاہنواز ''اقبال اور اس کا عہد'' میں اقبال کی مثنوی 'اسرار خودی کی 1915 میں اشاعت کے بعد اٹھے طوفان پر لکھتے ہیں۔

''اس نے روایتی ادب کے خلاف لکھا جو عرصۂ دراز سے خانقاہی مجاوروں یا نام نہاد صوفیوں کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوا تھا۔گو کہ اس بحث میں اقبال پر بہت سے قلمی حملے ہوئے لیکن اقبال

مرعوب نہ ہوئے کیوں کہ انہیں تصوف اور اسلام سے گہری واقفییت حاصل تھی۔صوفی تصوف کو خانقاہوں سے وابستہ کر کے اسے دبستان بنا کر اس کی ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتے تھے لیکن اقبال کے خیالات میں یہ درست نہ تھا۔اس نے تصوف کو اس کے اصلی معنوں اور حقیقت میں پیش کیا۔جس سے خواجہ حسن نظامی جیسا ایک بڑا طبقہ قلمی طور پر اقبال کے خلاف صف آرا ہوا اور تصوف کے موضوع پر اقبال اور صوفیوں کے درمیان تقریباً دو سال تک یعنی ۱۹۱۵ سے ۱۹۱۷ تک قلمی معرکہ ہوا، اس کی مثال دنیا کے کسی ادب میں نہیں ملتی۔اور آخر اکبر الہٰ آبادی کی کاوشوں سے اقبال اور صوفیوں کے درمیان جو جنگ ہو رہی تھی کا، تصفیہ خاموشی میں تبدیل ہوا، لیکن اس بحث میں تصوف اور اسلام کے موضوع پر گہرے اور دور رس نتائج سامنے آئے، جس سے اہل علم و ادب کی نظر میں اقبال کی افادیت و اہمیت میں اضافہ ہوا اور اس کے شعر و ادب کو بڑی گہرائی سے پڑھا جانے لگا۔" (اقبال اور اس کا عہد ۔ص۔۱۰)

اس متعلق ذکر کرنے لائق دو تین باتیں ہیں۔پہلی بات تو یہ کہ صوفی تصوف کو خانقاہوں سے وابستہ کر کے اسے دبستان بنا کر ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتے تھے، اس سے اختلاف کی گنجائش یوں نکلتی ہے کہ ان کے اس بیان سے اشارہ ملتا ہے کہ صوفی (واقعی صوفی یا جو کہ صوفیزم کا حق ادا کرتا ہو، ان کے نام پر جعلی لوگوں کی تعداد نہیں) خانقاہی اقتدار یا اس سے متعلق کسی دنیاوی خواہشاتی حرص و ہوس میں مبتلا تھے تو یہ درست نہیں ہے۔صوفیزم کی اپنی اعلیٰ روایت رہی ہے جس

کے طفیل ہی جموں وکشمیر کا خطہ بھی ۶۰۰ یا پھر ۶۵۰ سال قبل مشرف بہ اسلام ہوا۔ انہیں تصوف کا سہرا اپنے سر باندھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، کیوں تصوف اقبال سمیت تمام دیگر صوفیزم کے مداحوں نے کسی نہ کسی صورت میں روشنی وہیں سے حاصل کی ہے اور اپنے افکار وخیالات سے صوفیزم کے امکانات کی مزید راہیں استوار کی ہیں۔ دراصل خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے درمیان جو اختلاف تھا وہ صوفیزم کے نئے اور پرانے نظریات یا اس کی ردوقبول کے متعلق نہیں تھا جیسا کہ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے اپنی کلتاب ''اقبال۔ احوال واثار'' کے دو باب (۱) اکبرالٰہ آبادی ص۔ ۱۱۳ تا ۱۴۷، اور (۲) خواجہ حسن نظامی ص۔ ۲۲۳ تا ۲۳۹ میں اس واقعے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ چند نقاط سے یہ بحث شروع ہوئی تھی جیسا کہ ہر اہل علم طبقے میں ہوتا رہتا ہے لیکن درمیان میں اپنے کچے پکے علم کی نمائش کرنے والوں کا ایک خاص طبقہ جو کہ ہر شعبۂ ہائے زندگی میں آپ کو مل جائے گا، وہ کام بنانے کی جگہ اکثر کام بگاڑ دیتا ہے۔ اس بحث میں جہاں اقبال کی جانب سے کئی اہم نقاط سامنے آئے وہیں خود اقبال نے بھی خواجہ حسن نظامی کے مفید مشوروں کو تسلیم کیا جیسا کہ اکبرالٰہ آبادی نے اپنے ایک خط بتاریخ ۲۱ جنوری ۱۹۱۶ کو لکھا۔

''حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم ویاس ہو گیا۔ لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلۂ وحدت الوجود اور مسئلہ ٔ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔'' (ص۔۱۲۹)

۱۷ نومبر ۱۹۱۶ کے خط میں لکھتے ہیں۔

''حضرت اقبال کے خیالات میں بہت تبدیلی ہوئی، کم از کم اس کا اظہار ہوا۔ اب ان کو اچھی اور موزوں اور مربوط سوسائٹی مل جائے گی۔'' (ص۔۱۳۱)

ایک اور خط مورخہ ۳ نومبر ۱۹۱۶ کو لکھا۔

''اقبال صاحب نے مجھ کو خط لکھا ہے کہ مسئلہ امامت کو انہوں نے مان لیا۔''

(ایضاً)

ڈاکٹر شاہنواز کی اس کتاب میں متعدد ایسی باتیں بھی ہیں، جن سے پوری طرح اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ایک پیراگراف ذیل میں درج ہے۔

''۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸ تک کا زمانہ اقبال کی شاعری کا وہ زمانہ ہے جو یورپ میں بسر ہوا۔اسے اس کی شاعری اور عظمت کا منبع کہنا چاہئے، کیوں کہ اس نے یورپ میں جو ہر سطح کے مشاہدات کئے، انہوں نے نہ صرف اس کے خیالات کو جلا دی بلکہ اس کی فکر کی ایسی گتھیوں کو سلجھا دیا کہ اس کی ادبی صلاحیتیں معجزہ بن گئیں۔یہ عہد اقبال کی شاعری کا خاص عہد کہلاتا ہے۔''

(ص۔۱۱)

اس قسم کے متعدد بیانات اس کتاب میں مل جائیں گے۔انہیں خصوصیات کی بنیاد پر ان کی یہ کاوش لائق ستائش ہے۔

نام:شفیق احمد گنائی

قلمینام: شفیق مسعود

پیدائش: یکم مارچ ۱۹۶۳ء راجوری

ولدیت: عبدالعزیز گنائی

تعلیم: ایم۔اے(اردو،انگریزی)

تصنیف: جب گدھ لوٹ آئے (افسانوی مجموعہ)

وفات: ۲۰،جون ۱۹۹۸ء

پتہ:C/o Umar Farhat I.T.I.Road

Ward No.4 Rajouri

موبائل: 9055141889(Umar Farhat)

شفیق مسعود

شفیق مسعود مرحوم بھری جوانی میں اس طرح جدا ہوئے کہ پورا اردو ادب حیرت زدہ افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ بلاشبہ جوان کا تخلیقی ذہن تھا اور جن موضوعات اور جس اسلوب میں اس کا اظہار کیا ہے، اس سے یقیناً اہل ادب کی ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔لیکن اب شاعر کے اس شعر کہ

وے صورتیں الٰہی، کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے، آنکھیں ترستیاں ہیں

کے مصداق صبر وضبط کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔شفیق مسعود کا وہ مختصر افسانہ جس نے پوری اردو دنیا کو چونکا دیا ''جب گدھ لوٹ آئے'' ہے اور اسے پہلی مرتبہ رسالے میں شایع کرنے کا افتخار ''تحریک ادب'' کو حاصل ہے۔اس کے علاوہ ان کے نو(۹) افسانے یکجہ کر کے ان کے بھانجے اور اردو ادب میں اپنی جگہ مستحکم کئے جارہے جواں سال شاعر اور مدیر ''تفہیم'' عمر فرحت اور معروف تخلیق کار ڈاکٹر لیاقت جعفری صاحب نے شفیق مسعود کا ایک افسانوی مجموعہ بہ عنوان ''جب گدھ لوٹ آئے'' ترتیب دیا اور اس طرح اردو ادب میں بہترین اردو افسانوں کے زخیرے میں اضافہ کیا۔شفیق مسعود کے ان کل جمع دس افسانوں میں سے چند کو پڑھ کر جن بڑی بڑی شخصیات نے اپنے تاثر کا اظہار کیا ہے، ان میں سے چند کو مختصر طور پر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

''شفیق مسعود کے افسانوں کی دنیا میں دھندلے رنگ ہیں، موت اور عزیزوں سے بچھڑ جانے کے اندوہ ہیں اور عام انسانوں کے دکھ ہیں۔ یہ افسانے ہمیں معاصر دنیا کے تلخ حقائق

سے روشناس کراتے ہیں'' (شمس الرحمن فاروقی)

''شفیق مسعود کا افسانہ ''جب گدھ لوٹ آئے'' جدید افسانے کی ایک اچھی مثال ہے۔اس افسانے کا علامتی موضوع فی الحقیقت نہایت پیچیدہ ہے۔علامتی سطح پر یہ موضوع انسان کے مقدر کی شدید اور ڈرامائی جستجو، نامانوس، اجنبی اور حیرت آور ماحول میں زندگی کی معصومیت کے احساس سے محروم ہو جانے،موت کے قطب اور ناگزیری اور حیات بعد الموت وغیرہ کے پیچیدہ مفاہیم کو محیط ہے''

(نیر مسعود)

''مرحوم شفیق مسعود کے کچھ افسانوں میں علامتی اور تجریدی انداز دونوں گھل مل گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔شفیق مسعود ایسا افسانہ نگار ہے جو صورت حال کو کہانی سمجھتا ہے اور اس میں سے انسان اور زندگی کا مفہوم تلاش کرتا ہے۔'' (وارث علوی)

''شفیق مسعود کے لئے افسانے محض تفریح طبع کا سامان نہیں بلکہ بیش تر کی پیچیدہ، گہری اور دور رس حقیقت کے انکشاف کا ذریعہ ہے۔انہوں نے اپنے عہد کی مخصوص حسیت ،نفسیاتی رویواور تضادات کا عرفان حاصل کیا ہے۔'' (بلراج مینرا)

''مرحوم شفیق مسعود کے یہاں نیا انداز بھی ہے اور کہانی کا نیا تیور بھی، حساس طبیعت کو تلملا دینے والا بھی اور انبساط دینے والا بھی، درد کے گہرے سمندر میں کروٹیں بدلتا ہوا انسانی وجود کس

قدر بے بس ہو جاتا ہے، اس کا نقش ابھرتا ہے۔'' (پروفیسر وہاب اشرفی)

''مرحوم شفیق مسعود کے افسانوں میں اکثر علامتوں کا استعمال ملتا ہے۔ کہانی سناتے ہوئے وہ علامتی اسلوب اختیار کرتے ہیں تو لگتا ہے ان میں کہانی لکھنے کی عمدہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ کاش وہ زندہ رہتے۔'' (شکیل الرحمن)

''شفیق مسعود کے چند افسانوں پر نظر ڈالی تو حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات سے دو چار ہوا۔ یہ افسانے ایک جواں مرگ اور تازہ کار افسانہ نگار کے تخلیقی ذہن کی پیداوار ہیں۔''

(پروفیسر حامدی کاشمیری)

''شفیق مسعود کے یہاں جدید افسانہ کا ایک ایسا امتزاج پیدا ہوتا ہے کہ اپنی نسل کے افسانہ نگاروں میں ان کی حیثیت ایک نمائندہ افسانہ نگار کی ہوتی ہے اور شفیق مسعود کے فن کو کسی انداز سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' (پروفیسر شہریار)

''شفیق مسعود جو افسانوی فہم رکھتے ہیں، وہ بہت کم افسانہ نگاروں میں پائی جاتی ہے۔ انہیں واقعہ کو دہرانے کا ہنر آتا ہے۔ کردار کے باطن کو سمجھنے کی نظر رکھتے ہیں جو جزئیات کی تفصیل پیش کرنے کے بجائے انہوں نے ہر سطح پر ایجاز و اجمال سے کام لیا ہے۔'' (پروفیسر عتیق اللہ)

ان کے علاوہ بلراج کومل (شفیق مسعود کی افسانہ نگاری) انور سدید ''پاکستان'' (ایک غیر معمولی افسانہ نگار، شفیق مسعود) اور زبیر رضوی (جب گدھ لوٹ آئے ۔۔۔۔ایک تاثر) کے

مضامین بھی شفیق مسعود کے افسانوں کی تخلیقی اہمیت کے غماز ہیں۔اس افسانوی مجموعے میں جو دس (۱۰) افسانے شامل ہیں ان کے عنوان ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

۱۔جب گدھ لوٹ آئے

۲۔منزل

۳۔وہ آئے گی

۴۔ناخدا

۵۔کینسر وارڈ

۶۔کوئی بات نہیں

۷۔فنکار

۸۔وقت کی کتاب

۹۔واپسی

۱۰۔خوف سے حقیقت تک

جیسا کہ عنوان سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ شفیق مسعود کا تخلیقی ذہن کن موضوعات کی جانب زیادہ راغب تھا۔ان موضوعات کو کامیابی سے برت کر انہوں نے اپنا نام معتبر افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل کروالیا ہے۔

نمونہ تحریر

جب گدھ لوٹ آئے

بڑا۔۔۔ عجیب۔۔۔ منظر تھا۔ چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ نوجوان ، بوڑھے ، بچے ، عورتیں سب تھے ، لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ ہر لاش کے چہرے پر بلا کا سکون تھا اور انکھیں نیم وا تھیں۔ کہتے ہیں اگر مرنے والے کی آنکھیں کھلی رہ جائیں تو اس کی کوئی حسرت رہ جاتی ہے یا وہ کسی کا منتظر ہوتا ہے۔ ان لاشوں کے درمیان ایک مسخ شدہ بدبودار لاش بھی پڑی ہوئی تھی۔ یقیناً اس نے اپنی زندگی میں ایسی لاش کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گدھ لاشوں کے چاروں طرف بڑے بڑے بھدے پر پھیلائے پلاسٹک کے گیند کی طرح اچھلتے ہوئے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ شائد وہ کسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھے ، ان کی بے رونق آنکھیں ان کے اندر کی کیفیت کی چغلی کھا رہی تھیں۔

پنجوں کے بل بیٹھا ہوا تیز تیز سانس لیتا ایک مریل سا ایک آنکھ کا کانا کتا بھی وہاں موجود تھا۔ اسے صرف ایک طرف ہی نظر آتا تھا۔ دوسری طرف دیکھنے کے لئے اسے پوری گردن گھمانا پڑتی تھی ، اور گردن گھمانے کی اس میں سکت نہ تھی۔

ایک نوجوان اچھلتا ہوا اونچے پتھر پر بیٹھے ادھیڑ عمر گدھ کے پاس گیا اور بولا۔ ''جناب لاشیں ہمارے سامنے موجود ہیں ، کس بات کی دیر ہے۔ کیا ہم اپنا کام شروع کریں۔؟''

ادھیڑ عمر گدھ نے اسے ڈانٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم نوجوان بڑے شتاب کار ہوتے ہو ، ہر کام جلد بازی میں کرتے ہو اور خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔۔ جب تک بڑا نہیں آجاتا ، کچھ نہیں ہوگا''

''لیکن یہ بڑا کب آئے گا۔؟''

''ہم بھی اسی کے انتظار میں سوکھ رہے ہیں۔'' دوسرے نے فکر مند ہوتے ہوئے جواب دیا۔

دونوں گدھوں کے درمیان گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ مریل کانے کتے نے نہایت آہستہ سے کروٹ

لی۔تمام گدھ اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔گدھوں کو اس کی موجودگی ناگوار گزر رہی تھی۔ایک نے کہا۔

''کاش یہ اندھا ہوتا''۔دوسرے نے کراہت سے اپنی بھدی چونچ دوسری جانب پھیرتے ہوئے کہا۔''اچھا ہی ہوتا،اگر یہ مرجاتا!''

کتے نے اپنے دونوں اگلے پنجے زمین میں پسار دئے اور منہ پنجوں پر رکھ کر اپنی خارش زدہ گردن ڈھیلی چھوڑ دی۔ادھر آسمان پر گدھوں کا ایک بڑا قافلہ منڈلانے لگا تھا۔ایک گدھ زور زور سے چلانے لگا۔''وہ دیکھو،بڑا آ گیا''۔اور پھر تمام گدھ خلا میں گھورنے لگے۔بڑے کا قافلہ آہستہ آہستہ زمین پر اتر رہا تھا۔زمین پر اترتے ہی کچھ چند بزرگ گدھ اسے لاشوں کی طرف لے گئے۔بڑے نے نہایت غور سے لاشوں کا معائنہ کیا تو اس کی آنکھوں میں اداسی کے بادل چھا گئے۔یہ دیکھ کر ایک گدھ نے نہایت عاجزی سے کہا۔''حضور،حکم فرمایئے!کیا ہم ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم شروع کردیں۔؟''بڑے نے افسردگی سے جواب دیا۔''تم انہیں لاشیں سمجھتے ہو؟''

''جناب یہ لوگ اب مر گئے ہیں اور ہماری روایت ہے کہ ہم لاشوں پر ہی منڈلاتے ہیں اور لاشیں ہی کھایا کرتے ہیں''۔سارے گدھوں کی توجہ بڑے پر مرکوز ہوگئی۔اس نے گمبھیر لہجے میں بولنا شروع کیا:۔''میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ لاشیں نہیں ہوسکتیں۔ذرا غور سے دیکھو ان کے چہرے پر سکون ہیں،جیسے یہ تھکن سے چور ہوکر گہری نیند میں سوئے پڑے ہوں اور دیکھو ان کی آنکھیں بھی کھلی ہیں۔اور تم کہتے ہو،یہ لاشیں ہیں؟اگر ہم نے ان کو نوچنا شروع کیا اور یہ اٹھ کر بیٹھ گئے تو۔۔۔''بڑے کی آواز پر اسرار ہوتی جارہی تھی۔پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں بات آگے بڑھائی۔''دیکھو ان لاشوں کے درمیان ایک سڑی ہوئی بدبودار لاش پڑی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔وہ ہماری غذا ہوسکتی ہے،اگر روایت کو برقرار رکھنا ہو تو اسے نوچ سکتے ہو۔''

سب گدھ سڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھنے لگے،بڑے سمیت تمام گدھوں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی،سب سے پیچھے کھڑے ایک بزرگ گدھ نے ٹوکتے ہوئے کہا۔''لیکن جناب!ہم وہاں

تک پہنچیں گے کیسے؟ کیا یہ زندہ لاشیں ہمیں وہاں تک پہنچنے دیں گی؟''۔سب گدھوں کے جذبات سوڈا واٹر کے جھاگ کی طرح بیٹھتے چلے گئے اور پھر اگلے ہی لمحے سارے گدھ بڑے کے سامنے احتجاج کرنے لگے۔ بڑا گردن جھکائے، آنکھیں موندے کافی دیر تک ان کی بدکلامی سنتا رہا۔اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نظریں لاشعوری طور پر مریل کانے کتے کی جانب اٹھتی چلی گئیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارے گدھ کانے کتے پر ٹوٹ پڑے جو نہ جانے کب کا دم توڑ چکا تھا!!

نمونہ کلام

نام: محمد شفیق ملک
تخلص: عارش
ولدیت: محمد رفیق
پیشہ: کے۔اے۔ایس آفیسر
پتہ: Thanna Mang Darhal
Malkan Darhal Rajouri

غزل

دل کا موسم بدلنے لگا
درد سینے میں پلنے لگا
رات تارے اگلنے لگی
چاند بادل نگلنے لگا
آنکھ تیری ضیا پاش تھی
زخم میرا مچلنے لگا
مدتوں کی بیابانیاں
اب سمندر سنبھلنے لگا
عشق تھا فکر کی پھر بساط
حسن مہرے بدلنے لگا
ماتمی ماتمی آئینے
حسن تیرا جو ڈھلنے لگا
آج عارش غزل گو ہوئے
ان کو جانے کیوں کھلنے لگا

شفیق عارش

شفیق عارش کی غزلوں میں خیال وخواب اور حقیقت کی کشاکش نہیں ہے۔اس لیے ان کے یہاں حقیقت کو تسلیم کرنے اور خوابوں کو رد کرنے کا رجحان نہیں پایا جاتا۔ان کے یہاں خواب اور حقیقت ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر اپنے ہونے کا احساس تو کراتے ہیں، لیکن کوئی واضح لکیر جو کہ حد فاصل قائم کر سکے، نہیں ملتی۔ان کے یہاں عصر رواں کے علاوہ اور زمانوں کو بھی متحرک دیکھنے کا رجحان ملتا ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار دیکھے جائیں ؎

رات تارے اگلنے لگی
چاند بادل نگلنے لگا

عشق تھا فکر کی پھر بساط
حسن مہرے بدلنے لگا

لمحہ لمحہ امر ہوگا، جاوداں ہو جائے گی
زندگانی مٹتے ہی زندہ نشاں ہو جائے گی

ہولے ہولے جھیل کی لہریں ٹٹولو، دوتو
یہ کہانی کھل گئی تو خود بیاں ہو جائے گی

دیواریں بھی! در بھی! چھت بھی
بستی میں بس گھر نہ ملے

مندرجہ بالا اشعار میں روایت کے تصور کے ساتھ ساتھ نئے عہد کا منظر نامہ بھی شامل ہے۔شعر ۱/اور ۲/اور ۳/ ۴/اور ۵/میں واضح ہے کہ جو محسوس ہوتا ہے، وہ ذاتی اور انفرادی طرز

احساس ہے۔ عہد حاضر میں اور ہر عہد میں چند حقائق یکساں طور پر تخلیقی ذہنوں کو متاثر کرتے رہے ہیں اور ان کا اظہار اپنی اپنی تخلیقی صلاحیت کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ شعر نمبر ۵ رمیں جس خیال کو باندھا گیا ہے۔ اس سے ملتا جلتا میرا ایک شعر ہے ؎

کاوشوں کا ہوا ثمر غائب
در ہے، دیوار ہے، تو گھر غائب

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی اور انفرادی طرز کے ساتھ ساتھ نئے انسان کا رشتہ بھی ماضی سے کسی نہ کسی طور منسلک رہتا ہے اور اس کی نئی یا مختلف تبدیلی کو بدلی ہوئی حقیقت یا نئے دور کی علامت کے طور پر سمجھنے کے ساتھ ساتھ سماجی معیاروں کی روشنی میں چند مخصوص ذہنی قدروں کا پرستار رہنا بھی ضروری ہے۔ عارش کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ ان کے یہاں پرانی حقیقتیں بھی اپنی موجودہ صورت حال میں شامل ہیں۔ چند اشعار ؎

دل جلا آنکھ سے دھواں نکلا
درد ٹھہرا، کہاں کہاں نکلا

پھر اسی بات پر ہنسی آئی
پھر ہنسی پر وہ بدگماں نکلا

درد کی آگ کو پھر ہوا دے گیا
حافظہ مجھ کو میرا یہ کیا دے گیا

اس کا سودا عجب سے عجب تر رہا
ابتدا لے گیا، انتہا دے گیا

دیکھ کر شہر کے دروازے بند
گاؤں کا ادھ کھلا در یاد آیا

عارش نے اپنے مندرجہ بالا اشعار میں موجودہ عہد کی ان پیچیدگیوں کی جانب اشارہ کیا ہے جو انسان کے اعصابی، جذباتی اور فکری نظام کو متاثر کرتی ہیں۔ عہد حاضر میں چونکہ ذہنی اور جذباتی سہارے بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اور خاص طور پر شہری تہذیب میں انسانی قدر و قیمت کا تو زیادہ ہی فقدان ہو گیا ہے۔ جیسا کہ عارش کے شعر نمبر ۵ / سے ظاہر ہے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ دور حاضر میں ماضی کی طرح اخلاقی تہذیبی اور روحانی قدروں سے منسلک ہو کر فکر و عمل کے امکانات کو اس میں محدود کر دینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب۔ کیونکہ اپنے عہد کے سیاسی اور تہذیبی انتشار اور المیوں کی موجودگی سے انکار یا ان سے صرف نظر بھی ممکن نہیں ہے۔ اس طرح تخلیقی مقصد کی تکمیل ادھوری ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی شاعری میں خیر اور شر کو تقسیم کرنے کے بجائے انہیں مہذب دنیا کے مہذب انسانوں کے دو متضاد عمل کے طور پر دیکھا ہے۔ چند اشعار ۔

نئی امنگ کے سائے میں بھی چلا جائے
کسی کے واسطے ایسے ہی کیوں جلا جائے

دور اس پار لامکاں کے لیے
لمحہ لمحہ حیات کو بیچیں

کبھی صحرا کے ذرے جوڑ کر ساگر بناتا ہوں
کبھی پانی کی بوندیں ڈھونڈ کر پتھر بناتا ہوں

تری راہوں کے پتھر سے جو انس ہے ان نگاہوں کو
منڈیروں پر کھڑے ہو کر تراشوں انگلیاں کب تک

شفیق عارش کی مندرجہ بالا تخلیق کاوشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو ادب میں ان کے روشن مستقبل کی ضمانت تو دی ہی جا سکتی ہے۔

نام: صابر حسین

قلمی نام: صابر مرزا

تعلیم: پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

پیشہ: ریٹائرڈ ڈپٹی سکریٹری، کلچرل اکیڈمی

تصانیف: خوشبونما (اردو شعری مجموعہ)

صوبہ جموں کے علاقائی ادب پر اردو

کے اثرات

دینا ناتھ رفیق: بحیثیت شاعر

رنگ رتاں گلزار (پہاڑی شعری مجموعہ)

کوک کلیجا کیں (گوجری شعری مجموعہ)

تہکھدے موسم (پنجابی شعری مجموعہ)

اعزاز: کلچرل اکیڈمی ایوارد

پتہ: Madeena Colony Ward No. 2 Rajouri

نمونہ کلام

غزل

خوش ادا موسم رتوں کی شادمانی دیکھ لی
اۓ خدا، ہم نے تری ہر مہربانی دیکھ لی

ہر گھڑی، ہر قدم رکھا آنکھ پر لمحوں کا حال
ہر گھڑی، ہر آرزو، صدیوں پرانی دیکھ لی

یہ بھی دیکھا کہ بہت نا مہرباں تھا آفتاب
یہ بھی کیا کم اس کی ہر جا مہربانی دیکھ لی

آتی جاتی سب رتوں کے ہم ہی سر چشمہ بنے
آتے جاتے ہم نے ہی بر سر گرانی دیکھ لی

اک سراپا آگ تھا منظر کا پس منظر تمام
آنکھ نے رنگوں کی جب بھی خوش گمانی دیکھ لی

سایہ سایہ خواب تھے صابر چناروں کے تلے
سایہ سایہ گل رتوں کی سائبانی دیکھ لی

صابر مرزا

صابر مرزا کے اشعار میں اصلاح پسندی کا رجحان جہاں ان کے تخلیقی مزاج کو متعین کرنے میں بہت معاون ہے، وہیں ان کے عہد کے مخصوص مزاج کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ یہ اختصاص خیالات میں تضادات اور اپنے عہد کے تقاضوں میں کشمکش سے عبارت ہے۔ اس کشمکش کے اظہار کے لیے انہوں نے فن اور شعور دونوں سے کام لیا ہے۔ چند اشعار ـ

جیسے اب ہیں لوگ، پہلے ایسے سنجیدہ نہ تھے
زندگی کے رنگ بھی کچھ اتنے پیچیدہ نہ تھے

چپکے چپکے سن رہے تھے چپ کی جاں لیوا صدا
ساحلوں کے پیڑ پودے کوئی خوابیدہ نہ تھے

جلتے صحراؤں سے ہوکر دیکھنا بستی کی اور
پیاس لے کر ہی تو اب سوکھا سمندر آئے گا

وہ جو کل آفاق پر پھیلے تھے سب برفیلے رنگ
کاغذوں پر آئے تو برق و شرر ہونے لگے

ہے میسر جب کہ رت کی شعلگی
تو ہر اک منظر سے پس منظر تراش

صابر مرزا نے لفظ اور زبان کے اس جمالیاتی اور تخلیقی تصور کو اپنایا ہے جو اپنے مشاہدات اور تجزیاتی حسیت سے کوئی نہ کوئی نتیجہ بھی نکال لیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اقداری

ضروریات کو طبعی اور فعال حقیقتوں کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ یہ روپ، خواب اور حقیقت کے امتزاج سے وسیع تر شعری حقیقتوں کی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ شعری حقیقتیں جن تخیلات کے عملیات سے وجود میں آتی ہیں، وہ عقل کے محاسبے اور اخلاق کی قدروں کے بیش تر عنصر کو اپنے احاطۂ فکر میں لیے ہوئے ہے۔

معنی و مفہوم کی بے انتہا سرحد کے پار
کیسی تھی الفاظ کی جو زندگانی اور تھی

ان منظروں کی دھوپ سے، جسموں کی آگ سے
اے موسموں کی برف، تمازت ہی لے کے جا

جو ہوتا دل کے سمندر میں غوطہ زن سورج
ہم اپنے جسم کی شعلہ فشانیاں لکھتے

آسماں ناراض ہے، شعلے اگلتی ہے زمیں
آرزو کی لاش کو، کوئی کہاں دفنائے گا

پورے شفق کا رنگ اتار اپنی آنکھ میں!!
موسم کی ساری خوشبوئیں شیشوں میں دھو کے رکھ

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ صابر مرزا نے علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے۔ ان علامتی اظہارات میں انہوں نے کچھ ایسے سوالات بھی اٹھاتے ہیں جن کا تعلق معروضی تنقید سے ہے، اسی طرح یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ صابر مرزا کا تنقیدی شعور کتنا بالیدہ ہے اور وہ تنقیدی ادب سے کتنا شغف رکھتے ہیں۔ دراصل حساس شاعر جب کسی شئے کے وجود کی بنیادی حقیقت کی عکاسی کو اپنا شعار بناتا ہے تو معروضی تنقید سے متعلق اس قسم کے سوالات اور تخیلات کی پیچیدہ امیج کو بھی شعری جامہ پہنا کر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پال ویلیری نے اپنی کتاب دی

آرٹ آف پوئٹری میں لکھا ہے:

"منطقی دلائل اور مجرد فکر کے بارے میں عام طور پر لوگ جتنا جانتے ہیں، ہر سچا شاعر اس سے زیادہ اہلیت کا حامل ہوتا ہے۔"

(Pal Valery, The Art of Poetry, New York 1958 P 77)

صابر مرزا کے مزید اشعار دیکھے جائیں ؎

برخود غلط تھا آئینہ چہرہ غبار تھا
اندر تھی ایک آگ تو باہر حصار تھا

ساعتوں کے نحیف ماتھوں پر
وقت لکھ دے گا گھاؤ ایسے میں

جبیں کو ٹکائیں گے دھرتی پہ ایسے
کہ سجدے میں لوح و قلم دیکھ لیں گے

میں کیسے خوں رنگ آئینوں میں رکھوں ہواؤں کے سادہ چہرے
اٹھائے بے حاصلی کی لاشیں، میں خوں زدہ کتنے باب دیکھوں

یہ آتشیں واردات ساری جو سرخ کاغذ نے مجھ کو دی ہے
کتاب لمحوں کی کوئی لاؤ کہ حادثوں کے حساب دیکھوں

صابر مرزا نے زبان و بیان کے مقابلے میں کسی منفرد یا اجتماعی تبدیلی کو تو اپنی شعری حسیت کا مرکز نہیں بنایا ہے، لیکن لفظوں کے برتاؤ اور انتخاب کے ذریعہ انہوں نے جو شعر تخلیق کیے ہیں اور ان کے توسط سے معنی و مفہوم کی جو فضا قائم کی ہے، ان کا اطلاق کسی ایک مخصوص معنی پر نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے اپنے اشعار کی تفہیم کے سلسلے میں راہیں کھول دی ہیں، جن سے گذر کر قارئین اپنی اختراعی منزلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں اسے صابر مرزا کی بڑی کامیابی کہوں گا۔ ان

کے یہاں موضوعاتی اور معنیاتی سطح پر تلاش و جستجو کا عمل جاری ہے۔جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

سجا کر آنکھ پر رکھتے اسے ہم روز محشر تک
وہ اک ساعت خدایا اب کہ لافانی چلی آئی

افسوس کہ اس لافانی ساعت کا متلاشی کچھ دن ہوئے، ہم سے جدا ہو کر مالک حقیقی سے جاملا۔اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔

نام: ڈاکٹر عبدالرشید منہاس

ولدیت: شاہ ولی

پیدائش: ۴، فروری ۱۹۷۲ء، فتح پور، راجوری

تعلیم: ایم۔اے۔ایم۔فل۔پی۔ایچ۔ڈی

پیشہ: سینیئر اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

رسائل میں شایع مضامین: ۲۷ تصانیف: (ا) ۱۹۷۰ء کے بعد کے اہم فکشن نگار عبدالصمد

اضافی عہدہ: اسسٹنٹ دین، اسٹوڈنٹ ویلفئر، یونیورسٹی آف جموں

عالمی سیمینار میں شرکت: ۶، بار عالمی اردو کانفرنس: ۱ ملکی سیمینار: ۲۰ صوبائی سطح کے: ۲۰، مذہبی سطح کے: ۱۵ ورک شاپ: ۱۰ یو۔جی۔سی۔پروگرام: ۲ یو۔جی۔سی رفریشر کورس: ۲ یوتھ فسٹیول میں شرکت: ۱

شمالی زون یوتھ فسٹیول: ۴

رکن: کلچرل کمیٹی آف جموں یونیورسٹی، شعبۂ ریسرچ کمیٹی، تحفظ، قائدہ وقانون اور دیگر اخلاقی امور، جموں یونیورسٹی

تاحیات رکن: تہذیب الاخلاق اردو (علی گرھ)، تحریک ادب اردو (وارانسی)

رکن: پہاڑی ایڈوائزری بورڈ، حکومت جموں وکشمیر،

زیر نگہبانی ایم۔فل اسکالر: ۱۲

پی۔ایچ ڈی اسکالر: ۶

پتہ: Dept. of Urdu Jammu University,Jammu.- 180006

Fateh Pur ,Rajouri

موبائل: 9419153883

ڈاکٹر عبدالرشید منہاس

ڈاکٹر عبدالرشید منہاس ریاست جموں وکشمیر کے ان نثر نگاروں میں ہیں، جنہوں نے بہت عمدہ تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں اور ریاست سے باہر بھی پوری اردو دنیا میں اپنی ادبی شناخت کے نشانات ثبت کئے ہیں۔ان کے مضامین جہاں مختلف شعراء وفکشن نگاروں پر ہیں وہیں انہوں نے مختلف اصناف کے متعلق بھی تحقیقی اور معلوماتی مضامین کی خاصی تعداد ہے۔ان کا ایک مضمون ''نیا افسانہ اور موجودہ معاشرہ ہے، جس میں آج کی کہانی پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> ''اصل میں آج کی کہانی کس طرح کی کہانی ہے، اس سے میری مراد ہے کہ آج کا جدید افسانہ کس طرح کا افسانہ ہے، اور اس طرح جدید دور کے کن کن مسائل کو افسانہ نگار اپنے افسانوں میں پیش کر رہے ہیں ۔اگر میں یہ بات کہوں کہ آج کی کہانی علامتی بھی ہے اور تجریدی بھی ،استعاراتی بھی اور کہیں کہیں conventional بھی ہے، یعنی روایتی افسانہ نگار بھی آپ کو اس دور میں ضرور مل جائیں گے،لیکن آج زیادہ زور علامتی، تجریدی اور استعاراتی کہانیاں لکھنے پر صرف کیا جا رہا ہے۔آج کے افسانہ نگار ہماری زندگی کے گونا گوں مسائل کو استعاراتی انداز میں پیش کر رہے ہیں۔''

جیسا کہ اقتباس سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے یہ بتایا ہے کہ کوئی بھی تحریک ہو یا رجحان، بھلے وہ کتنا ہی پرانا اور فرسودہ کیوں نہ ہو، اس کے لدادہ بھی ہر دور میں موجود رہتے ہیں

۔اور میرے خیال میں یہ مستحسن عمل اس لئے ہے کہ ان کی تحریروں سے ہی ہمیں اس دور کے غالب رجحان کے اہم عناصر کی دریافت ممکن ہو پاتی ہے۔اس کے ساتھ ہی ہم پر ان کی خامیوں کے سبب یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ آیا وہ کون سی کمزوریاں راہ پا گئی تھی ، یا کس ضروری تبدیلی سے اس دور کے بیش تر ادبا نے انحراف کیا اور حقیقت اور صورت حال کا ساتھ نہ دینے کے سبب دوسرا رجحان سامنے آیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس متعلق لکھا ہے۔

"نئے افسانہ نگار فکر واحساس اور اظہار واسلوب کے یکسر نئے نئے مسئلے سے دو چار تھے ۔ان کے دلوں میں ایک انجانا کرب اور نئی آگ تھی ،جس کی وجہ سے نئے افسانے کا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلنے لگا تھا۔اردو میں پریم چند سے لے کر منٹو اور پھر بیدی تک حقیقت نگاری میں کچھ ایسی سطحیں تھیں ،جن سے علامتی مفاہیم کا اکھوا پھوٹ سکتا تھا،لیکن باقائدہ علامتی کہانی کا آغاز ۶۰ ـ ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد اور ہندوستان میں بلراج مینرا اور سریندر پرکاش کی نسل سے ہوا، ان کے ساتھ ساتھ دوسرے افسانہ نگار اٹھے اور دیکھتے دیکھتے اردو افسانے کے زمین وآسماں بدل گئے۔"

(نیا افسانہ: علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر، بحوالہ۔ نیا اردو افسانہ، انتخاب، تجزئے اور مباحث، مرتبہ: گوپی چند نارنگ ،ص ۴۵)

جیسا کہ ڈاکٹر عبدالرشید منہاس نے بیان کیا کہ آجکل علامتی تجریدی اور استعاراتی کہانیاں لکھنے پر زیادہ زور صرف کیا جا رہا ہے،تو ان کی مراد یقیناً مابعد جدیدیت کے اس رجحان سے ہے جس میں کہانی اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے۔جدیدیت کے نام پر وہ نام ونہاد فرسودہ اور فرضی جذبات اور زبردستی کا اکیلا پن جس نے تنہائی اور اس سے منسلک اذیتوں کے اصل

مفہوم ومعنی تبدیل کر کے سستی اور وقتی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی ،وہ خود آج از کار رفتہ ہو چکی ہے۔اسی مضمون میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے مذکورہ مضمون (اردو افسانہ : روایت سے انحراف اور مقلدین کے لئے لمحہ فکریہ) میں آواز اٹھائی تھی کہ علامتی کہانی ہر فنکار کی کہانی نہیں ہے۔ضروری نہیں کہ نئی کہانی میں بھیڑ چال شروع ہو جائے اور ہر شخص علامتی، تمثیلی کہانی لکھنے لگے۔۔۔۔۔۔۔میرا معروضہ یہ تھا کہ وہ افسانہ نگار بھی جو سیدھی سادی کہانی لکھنے پر بھی قادر نہیں، وہ بھی علامتی کہانی کے چکر میں ایسی تحریروں کے انبار لگا دیں، جو کھینچ تان کر بھی نہ کہانی کہی جا سکتی ہیں، نہ انشائیہ، نہ کچھ اور۔پچھلے دس بارہ برسوں میں علامتی کہانی کے نام پر اس طرح کی بے مزہ تحریریں اتنی بڑی تعداد میں شایع ہوئی ہیں کہ مقلدین کی اس یلغار سے علامتی کہانی کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔" (ایضاً، ص ۴۷)

یہ بات ذہن میں رکھنے والی ہے کہ نارنگ صاحب کی یہ تحریر ۱۹۸۱ء میں شایع کتاب میں شامل ہے۔ظاہر ہے کہ اس کے بعد بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور نئے موضوعات کو نئی فکر کے ساتھ برتا گیا۔اس کی دلیل کے طور پر عبدالرشید منہاس نے اپنے مضمون "اکیسویں صدی میں اردو افسانہ" میں جن افسانوں کا حوالہ دے کر دلیل کے ساتھ بات کی ہے وہ ان کی تخلیقی اور تحقیقی بصیرت کی غمازی کرتے ہیں۔وہ افسانے اور ان کے خالق کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔چاکر (اسد محمد خاں) ۲۔طوفان (سید محمد اشرف) ۳۔باد صبا کا انتظار (سید محمد اشرف) ۴۔گنبد کے کبوتر (شوکت حیات)۔اپنے اس مضمون کا اختتام کرتے ہوئے اس نتیجے پر

پہنچے ہیں:

''مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور کے افسانہ نگاروں نے جس طرح عصری ماحول کے سلگتے ہوئے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے ،وہیں ایک نئے اسلوب اور treatment کا استعمال بھی کیا ہے۔آج کہانی نہ صرف کسی ایک خطے، ریاست یا ملک تک محدود رہی ہے بلکہ بین الاقوامی سطح کے مسائل کو بھی اجاگر کر رہی ہے۔یعنی کس طرح سے آج عورتوں اور بچوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں یا ایک خاص طبقے کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا جا رہا ہے، دہشت گردی کے الزام عائد کئے جا رہے اور انہیں جیلوں میں مقید کیا جا رہا ہے ،یعنی اب کہانی اقوامی سطح سے اوپر اٹھ کر بین الاقوامی سطح کے مسائل کو پیش کر رہی ہے۔کہانی کا canvas اب international مسائل کو اپنے اندر سمیٹ رہا ہے۔ایک خاص طبقے کے لئے بین الاقوامی سطح پر کس طرح سے منافقت اور ریا کاری زور پکڑتی جا رہی ہیں، خواہشات بڑھتی جا رہی ہیں، قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا جا رہا ہے، ان مسائل کو نہایت ہی جدید ہنر مندی کے ساتھ پیش کرنے میں ہمارے افسانہ نگار کامیاب نظر آتے ہیں اور جس صداقت کے ساتھ موجودہ افسانہ نگاران واقعات و سانحات کو اپنے افسانوں میں پیش کر رہے ہیں، اس سے ان کی قدر و قیمت ادب میں اور بھی بڑھتی رہے گی ۔''

اسی طرح عبدالرشید منہاس نے جو شخصی مضامین لکھے ہیں، ان میں کام کی باتیں ہوتی ہیں اور کوئی نہ کوئی ایسا پہلو ضرور ہوتا ہے جس سے اس شخص کی اہمیت و افادیت میں اضافے کے پہلو تلاش کئے جا سکیں۔ حضرت امیر خسرو پر جتنے بھی تخلیق کاروں نے لکھا ہے، ان میں ایک بات ضرور ہوتی ہے کہ ان کے کلام کا از سر نع مطالعہ از حد ضروری ہے، ان کے تمام کلام کا یکجہ ہونا اور اس کی اجکل کی اردو میں عمدہ تشریح بھی لازمی ہے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اس عظیم شاعر کے کلام سے روشناس ہوں، ان سے استفادہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، اس لئے انہوں نے امیر خسرو کو سمجھنے کی کچھ ذمہ داری اردو اسکالروں پر بھی ڈال دی ہے، لکھتے ہیں۔

''اس شہرۂ آفاق شاعر و ادیب کا آج تک کوئی بھی ثانی پیدا نہیں ہوا اور نہ ہونے کی اب امید ہے۔ اس لئے موجودہ دور میں ان کے نثری اور شعری کلام کا از سر نو مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا تمام نثری و شعری مواد تحقیق کا طلبگار بھی ہے۔ نئی نسل کو ان کے کلام سے روشناس کروانے کی اشد ضرورت ہے اور یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب نئی نسل کو ان کے تمام مواد پر تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھنے کی طرف مائل کیا جائے!

اس طرح عبدالرشید منہاس کی قلم سے مزید شاہکار نکلنے کی توقع ہم سب کو ہے۔

نام: عبدالغنی جاگل

ولدیت: الحاج وزیر محمد آسی

تعلیم: BE-Civil فاضل، دینیات، ادیب کامل

پیشہ: ایگزیکیٹو انجینئر

ذریعہ اظہار: اردو، پہاڑی، گوجری

تصانیف: واقعات اکابر

سلگتا صحرا (شعری مجموعہ)

داغ داغ اجالا (شعری مجموعہ)

حوصلوں کے پر (شعری مجموعہ)

سروش (شعری مجموعہ)

حکایت نیم شب (افسانوی مجموعہ) تن ورق

تحریر (سائیں قادر یار کی شخصیت اور شاعری)

نقش دیگر (مسعود احمد چودھری

شخصیت اور خدمات)

پتہ: Gursai, Phamra Nar,

Tehsil-Mehndhar

203, Sector -2, Pali Hill

Nawabad, Chhanni Rama

Jammu

موبائل: 9419791802

7889837758

کسی کردار پر آنکھیں جمی ہیں
علمبردار پر آنکھیں جمی ہیں

نمونہ کلام

غزل

کسی کردار پر سکھیں جنی ہیں
علمبتدار پر سکھیں جمی ہیں

یہ دل تھرا رہا ہے پھر بھی لیکن
لب اظہار پر سکھیں جمی ہیں

کرے گی کب تری تصویر باتیں
اسی دیوار پر آنکھیں جمی ہیں

یہ دل تھرا رہا ہے پھر بھی لیکن
لب اظہار پر آنکھیں جمی ہیں

ہوا رخصت مسیحا، بات کیا ہے
کہ میخ و دار پر آنکھیں جمی ہیں

فرشتہ اجل کیوں ڈر گیا ہے
غنی، معمار پر آنکھیں جمی ہیں

عبدالغنی جاگل

عبدالغنی جاگل کے اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ صاف طور پر لوگوں تک پہنچانے کے
لیے کسی خیال کو منظم نہیں کرتے بلکہ ایک تاثر جو کہ شعر میں ڈھلنے کے بعد ایک کیفیت یا ایک دیر پا
تجربے کی صورت میں سامنے آتا ہے، وہ شعور اور جذبے کی آمیزش کے ساتھ یہ لمحاتی تاثر وقت
کے ایک بڑے کینوس پر پھیل جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو عبدالغنی جاگل کے یہاں لفظ
ادائے خیال کی خدمت انجام دینے کی بجائے ایک تجربہ یا ایک پراسرار تاثر بن جاتا ہے۔ شاعری
کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے طور پر علیحدہ نظام فکر ہے اور اس کی تفہیم کے لیے خصوصی
مہارت اور تربیت درکار ہے۔ عبدالغنی جاگل کی کاوشوں پر غور کیا جائے تو اس ضمن میں ان کی تخلیقی
روش مستحسن ہے۔ ان کے چند اشعار دیکھیں جائیں۔

کسی کردار پر آنکھیں جمی ہیں
علمبردار پر آنکھیں جمی ہیں

یہ دل تھرا رہا ہے، پھر بھی لیکن
لب اظہار پر آنکھیں جمی ہیں

فرشتہ ٔ اجل کیوں ڈر گیا ہے
غنی، معمار پر آنکھیں جمی ہیں

عبدالغنی جاگل کے مندرجہ بالا اشعار زندگی کی مختلف الجھنوں کی مختلف پیرائے میں

پیش کرتے ہیں۔انسان کے شعور کی زرخیزی نے اس کے خوابوں کوایک نئی حسیت سے ہم کنار کیا ہے اور اس کے مقصد کی حصول یابی میں فکر کی کشادگی،عزم کا جلال اور اس تعلق سے اس کی جدو جہد کی توانائی میں اضافہ کیا ہے۔لیکن اس جدو جہد میں تیز رفتاری اور حد سے زیادہ اعتماد یا یوں کہیں کہ مصنوعی اعتقاد کی بالادستی کا ایک مضر اثر یہ ہوا کہ جذبات زندگی اور عقائد کے تعلق سے ذہنی سہاروں کی نوعتیں متاثر ہوئی ہیں جیسا کہ ان کے شعر نمبر (۴) سے ظاہر ہے۔اس قسم کے عمل اس اندوہ ناک حقیقت کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ انسان خود کو طاقت کے بل پر خود کو ہی تباہ کرنے کی سازش رچ رہا ہے۔یہ ایک عجیب وغریب لیکن تلخ حقیقت ہے۔اس کا سبب شاید یہ بھی ہو کہ عمومی بحث یا پھر مفاد پرستی کے سبب بعض حقائق سے گریز اس قسم کے نتائج مرتب کرتے ہوں،جیسا کہ عبدالغنی جاگل نے کہا ہے۔

بات کی تہ تلک نہیں جاتے
لوگ باتیں فضول کرتے ہیں

بلبلے کی ہم جوانی ہو گئے
پل دو پل میں آنجہانی ہو گئے

نہ ہوں گی ختم جس کی داستانیں
وہ چشم خوں چکیدہ بھی ہمیں تھے

ہمیں سے زینت دار بقا تھی
بڑے آفت رسیدہ بھی ہمیں تھے

خدا کے فضل کا دریا رواں تھا
ہمارے جنگلوں میں بارشیں تھیں

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ ان میں سماجی اور سیاسی طور پہ ردو قبول قسم کے نظریات شامل ہیں، ان کے مثبت اور منفی پہلو کی جانب بھی اشارہ ملتا ہے اور حق وصداقت پر عمل کرنے کی جزا کے طور پر خیر و برکت کے چشمے بھی رواں ہوتے ہیں جیسا کہ شعر نمبر (۴) سے ظاہر ہے۔عبدالغنی جاگل نے اس کے علاوہ تین اشعار میں اس تشویش کا اظہار کیا ہے بلکہ ایک طرح سے نتیجے پر پہنچ گئے ہیں کہ مثبت قدروں کی پاسداری بھی اب اتنی غیر جانب دار نہیں رہی جس کا کہ پہلے ایک طرح سے دعویٰ بھی کیا جاتا رہا ہے،لیکن سماجی، سیاسی کے ساتھ ساتھ سائنسی فکر میں خود اعتمادی کی کمی نے آج کی صورت حال کو یا تو یکسر بدل دیا ہے یا پھر شک کے دائرے میں لا کھڑا کیا ہے۔مختلف سماجی تجربات نے جہاں مذہب کی تعبیروں کو متاثر کیا ہے ، وہیں ایسے نظام کی تشکیل کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے جس میں واحد تجربوں اور اصولی ڈھانچوں میں اس قسم کی مطابقت پیدا کرنا شامل تھا کہ جس کے نتائج پر اکثریت کا اتفاق ہو۔لیکن ظاہر ہے کہ اس پر انتشار دور میں یہ ممکن نہ ہو سکا اور کچھ اس قسم کا ماحول و منظر سامنے آیا ہے، جس کا اظہار ان کی اس غزل میں بخوبی ہوا ہے۔

بھیڑ کا رخ ہے بڑے گھر کی طرف
ہے رواں دریا ،سمندر کی طرف

دل کے باہر کب ملا کوئی سراغ
ڈھونڈ اس کو اپنے اندر کی طرف

دیکھتے ہیں مسجد ویراں کے در
بے نیازئ قلندر کی طرف

دیکھ کر کھیتوں کو زہر آلود اب
طائروں کا رخ ہے بنجر کی طرف
کس نے چھینی درد کی دولت غنی
بڑھ رہے ہیں ہاتھ خنجر کی طرف

عبدالغنی جاگل کے اشعار سے واضح ہے کہ اس قسم کے اثرات بیسویں صدی کی اخلاقیات پر بھی مرتب ہوئے تھے، لیکن انسان کے باطن حالات، معاشرت، تاریخ، مذہب، روایت اور نسلی رشتوں کے جبر سے الگ الگ اور کبھی ان کے باہم منسلک ہو جانے پر بھی وہ قوت ارادی رکھتا ہے جو اس کی آزاد فطرت اور انفرادیت کے تحفظ میں بے حد معاون ہے۔ یہ آزاد فطرت معاشرے کے نظم وضبط کے لئے سازگار ماحول کی تعبیر بھی کرسکتی یا کرتی ہے۔ عبدالغنی جاگل کے نذدیک افراد کی انفرادیتوں کی خود مختاری بعض اوقات ایسی غیر متوقع کیفیتوں کا اظہار، ابہام، اسرار، اور پیچیدگی سے کرتی ہے کہ وہ تخلیق کار کے تخلیقی تجربے میں شامل ہو کر خیال اور عمل، عقیدت اور ایمان اور ذہنی مرعوبیت کے جذبے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

کچھ بڑوں سے مجھے شکایت ہے
اس لئے میں بڑا نہیں ہوتا

آگ سے اس طرح نہ کھیلو تم
'آگ کا کچھ پتہ نہیں ہوتا'

نگاہ شوق بہر حال ڈھونڈ ہی لے گی
کمال کے ہیں جو بندے، کمال کرتے ہیں

یہ زباں سچ کی بدولت ایک دن
بے زبانوں کی زباں ہو جائے گی

جسم کی دیوار گرنے دے غنی
ریت کی صورت رواں ہو جائے گی

عبدالغنی جاگل کی شاعری مادی دنیا کے ہر عکس کو قبول نہیں کرتی۔ وہ خارجی مظاہر کے وجود کو مثبت سمجھتے ہیں لیکن اسے ایک مشینی عمل کے طور پر یعنی جذبات و احساسات سے عاری شئے کے طور پر تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ ہر شئے کی چھان پھٹک، غور و فکر اور مشاہدات و تجربات کی کسوٹی پر کھرے کھوٹے کے عمل سے گزارنے کے بعد کسی فیصلے یا نتیجے پر پہنچنے کے روئے کو تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

سطحیت سے مجھے بھی نفرت ہے
شعر گہرا چناب ہونے دو

نمونہ کلام

نام: ڈاکٹر سید علمدار حسین شاہ کاظمی

قلمی نام: علمدار عدم

ولدیت: سید لعل حسین شاہ کاظمی

پیدائش: ۱۹۷۶ء

تعلیم: ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو)

پیشہ: ملازمت، کلچرل اکیڈمی

تصانیف: اردو غزل کی تاریخ اور تنقید

آگہی کا سفر

پتہ: Mauza.Qasba, Tahsil Haveli, Poonch

موبائل: 9419197759

غزل

زمانے کا مقدر ہو گیا ہے
وہ صحرا تھا، سمندر ہو گیا ہے

نگلتا جا رہا ہے آسماں بھی
جہاں والو! وہ اجگر ہو گیا ہے

ہر اک اس کی ہی جانب دیکھتا ہے
وہ جیسے کوئی منظر ہو گیا ہے

کسی آسیب کا سایہ ہے اس پر
ہوا ہے چپ کہ پتھر ہو گیا ہے

فقیروں کو امیری دے رہا ہے
خدا بھی اب قلندر ہو گیا ہے

ڈاکٹر علمدار عدم

علمدار عدم کے یہاں جدید شعری رویوں کی خاکہ کشی کے جو عناصر ملتے ہیں، ان میں نئے خیالات کی کامرانی اور نئے سماج کی تشکیل کی خواہش اول درجہ رکھتی ہے۔ان کے اشعار میں جن موضوعات پر اظہار خیال ملتا ہے ان میں انسانی مقدر کی بے چارگی، تنہائی کی اذیت، باطن کی کشمکش، صنعتی تہذیب میں گم ہوتی ہوئی انسانیت خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ چند اشعار ذیل میں درج ہیں ۔

ٹھہر گئے ہیں جنوں کی ہر ایک سرحد پہ
کہ آگہی کا ہمیں انتظار کرنا ہے

ہم تو خواب دکھا سکتے ہیں
تو ان کی تعبیر بنالے

فصیل جسم خود سے پوچھتی ہے
یہ کس کی انگلیوں کا ذائقہ ہے

اس نے خوش رہنے کی کھائی ہے قسم
وہ کہانی کا نیا کردار ہے

کردار بولتا ہے کہانی کے درمیاں
دریا ٹھہر گیا ہے روانی کے درمیاں

علمدار عدم کے مندرجہ بالا اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب اور فن کو لازمی طور پر

سماجی ارتقا کے معیار سے مربوط نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک مصنوعی یا عارضی صداقتیں کلی صداقتوں کا نعم البدل نہیں ہوتیں اور ان کے ذریعہ کیے جا رہے استحصال کی پرچھائیاں بھی کسی نہ کسی صورت میں مرتعش ہو جاتی ہیں۔ شمیم حنفی نے لکھا ہے۔

''جدیدیت فنی معیاروں کی جستجو میں جمالیات کی شرط کو اولیت دیتی ہے اور اسی لیے بیرونی یا سماجی حقیقتوں کی ناگزیریت کو تسلیم کرنے کے باوجود، اس معروضی فاصلے کی ضرورت اور انفرادی لمحوں کی دریافت پر زور دیتی ہے جو شاعر کی آواز کو محض ماحول کی بازگشت نہ بنائے۔''

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، شمیم حنفی، ص ر ۵۳)

علمدار عدم بھی جدیدیت کے اس نقطۂ نظر سے متاثر ہیں جس کا ثبوت ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔

ہم کتاب زندگی لکھتے رہے
اور برابر حاشیے بنتے گئے

ڈوبتے سورج کی آنکھوں میں عدم
کیسے کیسے زاویے بنتے گئے

میرے بچپن کے سب کھیل مرجھا گئے
مجھ میں پلتا رہا آگہی کا بدن

سرحدوں پر گولیاں چلنے سے یہ نہ سوچیے
آدمی کا آدمی سے رابطہ کٹ جائے گا

علمدار عدم ابھی نوجوان ہیں، اردگرد کے ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنے مطالعے کی وسعت کو مزید وسیع کرتے ہوئے اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے اسی طرح اپنی تخلیقی کارکردگی کو انجام دیتے رہیں۔

نام: ڈاکٹر عبدالحق نعیمی

ولدیت: مرزا نذیر حسین

پیدائش: ۵، فرور ۱۹۶۸ء تھنہ منڈی، راجوری

تعلیم: پی۔ ایچ ڈی (اردو)

پیشہ: سینیئر اسسٹنٹ پروفیسر گورمنٹ پی۔ جی۔ کالج، راجوری

ایوارڈ: ماسٹر عبدالعزیز وانی

جے۔ یو۔ آر۔ ایس۔ اے

اردو ایوارڈ جے۔ یو۔

سرسید احمد خاں ایوارڈ

پتہ: R/O Badhakana P/O Bhattian Tehsil Thanna Mandi

Distt. Rajouri-185131

موبائل: 9419660450 01962262510

ڈاکٹر عبدالحق نعیمی

عبدالحق نعیمی خطہ ٔ پیر پنچال کے معتبر نثر نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ان کے مضامین کے مجموعے بہ عنوان ''تعبیر و تفہیم'' میں شامل مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف موضوعات کے انتخاب میں اپنے تخلیقی ذہن کا ثبوت دیا ہے بلکہ مضامین بھی بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھے ہیں۔ان کی زیر نظر کتاب میں جو مضامین شامل ہیں ان کے عنوان ذیل میں درج ہیں۔

۱۔میاں محمد بخش اور علامہ اقبال

۲۔غالب کا عالم خیال

۳۔فکر اقبال کا مختصر جائزہ

۴۔مولانا ابوالکلام کا تصور دین

۵۔فیض کا فکری تناظر

۶۔اقبال کی شاعری میں وطنیت

۷۔اقوال و امثال کی سماجی وادبی اہمیت

۸۔کہانی کا ارتقا۔۔۔۔۔۔ایک باب

۹۔پروفیسر منظر اعظمی۔۔۔۔۔۔۔چند تاثرات

۱۰۔عبدالغنی عبد۔۔۔۔حالات زندگی

۱۱۔نورالزماں صدیقی نور۔۔۔۔ایک تعارف

۱۲۔تیرے نفس کی موج سے نش ونمائے آرزو

۱۳۔مرزا عبدالرشید ایک نامور شخصیت

۱۴۔شاہباز راجوروی۔۔۔فن اور شخصیت

۱۵۔ڈاکٹر صابر مرزا، بحیثیت شاعر

۱۶۔ پروفیسر ظہور الدین سے ایک ملاقات

۱۷۔ پروفیسر انور حسین جرال۔۔۔میری نظر میں

ظاہر ہے کہ اس مجموعے میں جہاں اردو دنیا کی بڑی شخصیات کے فن پر گفتگو کی گئی ہے، وہیں خطۂ پیر پنچال کے تخلیق کاروں پر بھی خصوصی توجہ کی ہے۔علامہ اقبال جن پر اہل جموں و کشمیر

کو ناز ہے کہ وہ کشمیری نسل سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں کے ہر دوسرے نثر نگار کی اقبال کے فن پر یا تو کوئی نہ کوئی کتاب موجود ہے یا پھر ایک یا ایک سے زائد مضامین۔عبدالحق نعیمی نے بھی ان سے اپنی محبت کے ثبوت میں اس کتاب میں دو مضمون شامل کئے ہیں۔ایک مضمون ''علامہ اقبال کی شاعری میں وطنیت''میں انہوں نے اقبال کے جن اشعار کے انتخاب کو ان کی وطن پرستی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، وہ ان کی عمیق نظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔چند اشعار ذیل میں درج ہیں:

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

یقیں محکم عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ، یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

آخری شعر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی جدو جہد آزادی اسلامی حکومت کے لئے تھی اور جو بعد میں پاکستان بننے کے ساتھ ہی ان کے خواب کی تعبیر کی صورت میں سامنے آئی۔لیکن اسے صرف ایک منفی سوچ ہی کہا جائے گا۔کئی تخلیق کار بالخصوص پاکستان سے تعلق رکھنے والے اوران کی شاعری کے ظاہری منظر نامے کی گہرائی کو نہ سمجھنے والے تخلیق کار اس طرح نہ صرف ان کی شاعری کو محدود کرتے ہیں بلکہ ایک طرح سے اقبال کے فن سے زیادتی بھی کرتے ہیں۔اگر اسلام کے دائرۂ کار میں بھی دیکھا جائے تو فکر اور فلسفے کے اعتبار سے اسلام جو کہ ایک فطری مذہب ہے،کی وسعت کا اندازہ ہی ناممکن ہے۔جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سارے عالم کے نبی ہیں اور مقدس کتابیں قرآن کی اور قرآن مقدس کتابوں کی تائید کرتا ہے اور قرآن میں سارے مذاہب کے ایک ہی ہونے یعنی ان کی اصل کے ایک ہونے کا ذکر ملتا ہے تو پھر اقبال کی شاعری جو اسلامی فلسفے کے زیر اثر ہے،تو اسے کیوں کر محدود کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح اقبال کی وطنیت کے تصور کو بھی محدود نہیں کیا جا سکتا۔اس نقطہ نظر سے جگن ناتھ آزاد نے بہت عمدہ بات کہی ہے۔

''معلوم نہیں ،بعض غیر ملکی طالب علمان اقبال کے دل میں یہ بات کیوں گھر کر گئی ہے کہ اقبال کی شاعری ہندو اور مسلمان کے دائرے میں محصور ہے۔ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب اقبال پر وہ بیسیوں کتابیں ہوں،جن میں اقبال کو ایک محدود انداز میں پیش کیا گیا ہے۔جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے،اقبال اس وقت ایک دوراہے پر ہیں۔اس حقیقت کو کہ اقبال کا سر چشمہ افکار بنیادی طور پر قرآن اور حدیث ہیں،اس طرح سے پیش کرنا کہ اقبال ہندو اور مسلمان کے تنگ دائروں سے باہر نہ نکل

سکیں، کلام اقبال اور فکر اقبال کے انتہائی بے احتیاط اور غیر ذمہ
دارانہ مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اقبال کو اس طرح محدود کر دینے سے
اقبال اور اسلام دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔"

(اقبال، صرف مسلمانوں کا شاعر، از۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، شب خون، شمارہ جون تا ستمبر ۲۰۰۵، ص ۲۹۳)

"فیض کا فکری تناظر" بھی عبدالحق نعیمی کا ایک بہترین مضمون ہے۔ اس میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے کہ فیض کی تخلیقی زندگی اور ذاتی زندگی میں بھی بہت حد تک اشتراکی نظریۂ حیات کا عمل دخل تھا، جس کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں روس میں لینن امن انعام سے ۱۹۶۲ء میں نوازا گیا۔ نعیمی صاحب نے ان کے فکری تناظر کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

"فیض کے فکری تناظر کا جائزہ لیتے وقت ہمیں ان کے دور کے
سیاسی حالات اور تہذیب و تمدن کو بھی ملحوظ نظر رکھنا ہو گا۔ اس
عہد کے قومی اور بین الاقوامی حالات، اس پر عمل اور ردعمل کو اگر
فراموش نہ کیا جائے تو معانی و مفاہیم کی گتھیاں سلجھتی ہوئی نظر
آئیں گی۔ فکری تناظر کی خوبی بھی یہی ہے کہ معانی و مطالب کا
بحر بیکراں بن جائے۔"

فیض کے فن کے متعلق جن نقاط کو ملحوظ رکھنے کی جانب نعیمی صاحب اشارہ کر رہے ہیں ، ان کی وضاحت کے ساتھ لدمیلا وسیلیوا نے بہت عمدہ مضمون بہ عنوان "فیض کا آخری زمانہ ۔۔۔ حیات اور شاعری کے پہلو" لکھا ہے جو شب خون جون تا دسمبر ۲۰۰۵ (شمارہ ۲۹۳ تا ۲۹۹) میں شایع ہوا ہے۔ مضمون کے آخر میں انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ دلچسپ ہی نہیں قابل قبول بھی ہے۔ لکھتی ہیں۔

"اس مضمون میں جو محدود شواہد پیش کئے گئے ہیں، ان کی بنا پر

یہ نتیجہ بہر حال اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری برسوں
میں فیض کے شعری مزاج نے ان کو تغیرات کا احساس
دلایا۔ ماسکو میں طویل مدت تک رہنے کے بعد فیض کو اس بات
کا شدید احساس ہونے لگا کہ ان کے نظریاتی نصب العین کی
بنیاد اتنی مضبوط نہیں ہے، جتنی شروع شروع میں معلوم ہوتی
تھی ۔ بے شک ان کے لئے یہ ایک بڑا المیہ تھا۔ فیض نے
دراصل ان واقعات کی گویا پیش بینی کی، جن کا خیال اس
زمانے کے کسی سوویٹ شہری کے خواب میں بھی نہیں آسکتا
تھا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فیض احمد فیض کے آخری دور کے کلام میں
،جس کی بنیادی خصوصیات سوالیہ یا متشکک لہجہ اور ڈرامائی اور
کبھی کبھی المیاتی رنگ ہے، بیسویں صدی کے اواخر کے عالم گیر
تغیرات کا، اور خاص طور سے اشتراکی نظام کی شکست کا عکس نظر
آتا ہے، جو شاعری کی پیغمبرانہ بصیرت کا ثبوت ہے۔''

(ص، ٦٧)

عبدالحق نعیمی صاحب آج بھی دل جمعی سے اردو ادب کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی تحریریں جہاں اہل اردو کے لئے مسرت کا باعث ہیں، وہیں نئی نسل کے لئے مشعل راہ بھی۔

نام: عبدالسلام

قلمی نام: بہار

ولدیت: خواجہ غلام احمد راتھر

پیدائش: پوشانہ، تحصیل سرنکوٹ، پونچھ

تعلیم: ایم۔اے، اردو۔سیاسیات، بی ایڈ، فاضل دینیات

تصانیف: سائیں میراں بخش۔۔ایک کامل درویش

سفر پاکستان

زندگی اور موت (دینیات)

اسلامی آداب خرد ونوش (دینیات)

شادی۔۔رسم ورواج

گھر سے بیت اللہ تک

کہاں گئے وہ لوگ (مضامین)

پیشہ: ریٹائرڈ زونل ایجوکیشن آفیسر

ذریعۂ اظہار: اردو

پتہ: Bahrot,Thanna Mandi rajouri-185213

موبائل: 9055119260

عبدالسلام بہار

عبدالسلام بہار صاحب خطۂ پیر پنچال کے نہ صرف کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں، بلکہ انہوں نے بہت عمدہ مضامین بھی لکھے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں۔ان کے افسانوں کی بڑی خاصیت یہ ہے کہ ان میں موجودہ معاشرے کے مفلس اور مجبور طبقوں کے درد کی عکاسی ہوتی ہے۔یہ وہ درد اور مجبوریاں ہیں جو یا تو نسل در نسل، زینہ بہ زینہ اور سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہیں یا پھر قسمت کی ستم ظریفی سے ان کی زندگی سے کبھی نا الگ ہونے والا جز بن جاتی ہیں۔ان کا افسانہ ''بوٹ پالش'' نسل در نسل کی مفلسی اور قسمت کی ستم ظریفی، دونوں کے حسین امتزاج کی بہترین مثال ہے۔اس کی منظر کشی اتنی پر اثر ہے کہ ذہن خود بہ خود متوجہ ہو جاتا ہے۔افسانے کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

''ایک چھوٹی عمر کا لڑکا پھٹے پرانے کپڑے پہنے لمبے لمبے بال مگر پریشان چہرے پر زمانے کی داستان غم لئے ٹرین میں داخل ہوا۔اس کے خشک ہونٹ بھوک اور پیاس کی علامت تھے، اس کے چہرے سے حسرت و یاس کے مٹتے ہوئے نشان دکھائی دے رہے تھے۔اس کی اندرونی کشمکش اس کے چہرے سے عیاں تھی۔لیکن اس کی زبان طوطے کی طرح چل رہی تھی۔''بوٹ پالش۔شیشے کی طرح چمکائے گا۔کریم پالش کرے گا۔''اس نے سب باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں۔ اس کی آنکھوں سے بے کسی اور مفلسی و ناداری کے آثار ٹپک رہے تھے۔''

اس پہلے پیراگراف میں ہی عبدالسلام نے بہت کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیا

ہے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ نسل در نسل مفلسی اور قسمت کی ستم ظریفی دونوں اس افسانے میں موجود ہیں۔نسل در نسل مفلسی کو بیان کرنے کے لئے اس افسانے کی چند سطروں کا سہارا لیا گیا ہے۔

''یہ بھگوان داس تھا، جسے باپ چند سال پہلے بے سہارا چھوڑ گیا تھا۔اب اس کے پاس ماں اور ایک بہن کا ذریعہ مُعاش صرف یہی دس پیسے میں بوٹ پالش تھا۔''

باپ کے مرنے کے بعد بیٹے کے ہاتھوں میں بوٹ پالش کا ڈبہ آ جانا اس بات کی علامت ہے کہ باپ کوئی امیر یا متوسط گھرانے کا فرد نہ تھا،نہیں تو بھگوان داس کی یہ حالت نہ ہوتی کیونکہ ورثے میں کچھ تو ہوتا۔اور اس کے باپ کا مفلس ہونا اس جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ اس کا باپ بھی مفلس تھا نہیں تو وہ کیوں مفلس ہوتا۔یہ سلسلہ در سلسلہ عذاب در عذاب کی کیفیت بھگوان داس کی قسمت کی ستم ظریفی (اس لئے کہ اس کا باپ بچپن میں ہی فوت ہو گیا) مل کر جو دردمند اور پر تاثیر منظر کشی کرتے ہیں، وہ قاری کے ذہن کو افسانے میں باندھ کر رکھتی ہے۔اس منظر کشی میں پریشان چہرے پر زمانے کی داستان غم ،خشک ہونٹوں کا بھوک اور پیاس کی علامت ہونا۔یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بھوک کی علامت تو درست ہے لیکن پیاس سے کیا واسطہ؟ وہ کوئی قید میں تو تھا نہیں کہ حکہ پانی اس پر حرام ہو۔ریلوے اسٹیشن جیسی جگہ پر جہاں ہر وقت مسافروں کی بھیڑ رہتی ہے،کم از کم پانی کا مفت انتظام تو سرکار کی طرف سے ہوتا ہی ہے۔لیکن جب افسانے کا ہم باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں تو عبدالسلام بہار کی الفاظ پر گرفت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔پیاس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ غلطی سے ایک یارڈ میں داخل ہو جانے کے سبب اسے پولس نے بہت مارا پیٹا تھا۔وہ بھوکا بھی تھا اور پیسے بھی نہ تھے اور ٹرین بھی چھوٹنے والی تھی ،اسی لئے اس نے کچھ روزی کمانے کے لئے پیاس کی بھی پرواہ نہ کی۔ان سب وجوہات کو یا دوسری وجوہات جو ممکن ہیں، کی جانب کوئی وضاحت نہیں ہے۔لیکن یہی تو اختصار کا فن ہے اور یہ

تخلیق کار کی تخلیقی رو ہے، جو افسانے میں برتے جانے پر تخلیق کے معیار کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کے ادبی معیار کو متعین کرنے میں بھی معاون ہوتی ہے۔ مہدی جعفر نے اس متعلق کچھ کار آمد باتیں کہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ افسانہ نگار کی تخلیقی رو افسانے میں کس قدر اپنا ظہور کرتی ہے۔ یہ تخلیقی رو افسانے کے تخلیقی عمل سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔ یعنی کس عنوان سے اور کس حد تک ہم آہنگ ہوتی ہے۔ تخلیقی رو کی کارفرمائی کا جائزہ لینے سے ہم ایک طرف تو افسانہ نگار کے طریقۂ کار کو اس عنوان سے جانچ سکتے ہیں کہ کہیں افسانہ نگار نے بیان بدل بدل کر اور ماحول یا منظر کی تبدیلی کر کے بار بار ایک ہی بات تو نہیں پیش کی ہے۔ یا اس کے برخلاف اس نے زندگی کی نئی سطحوں یا مسائل کا انکشاف کیا ہے۔'' (نئی افسانوی تقلیب، از۔ مہدی جعفر، ص، ۱۳)

اس افسانے کا اختتام بھی بڑا دردانگیز ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی جو کہ یہاں مزدور کی محنت اور اس کی مزدوری جو اسے ملی تھی، اس کے جلد بازی مین اپنے ہی ہاتھوں ضایع ہونے کا بیان افسانے کو اختتام پر اذیت کے عروج کی انتہا پر لے جاتا ہے۔ آخری اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ٹرین تیزی سے سیٹیاں بجانے لگی، سواریاں اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکی تھیں۔ چار بج چکے تھے۔ ٹرین آہستہ آہستہ سرکنے لگی تھی، بھگوان داس تیسرے بوٹ کو چمکانے میں مشغول تھا۔ ٹرین تیز ہونے لگی، بھگوان داس جلدی میں دروازے سے نیچے اترنے لگا۔ اس نے جوں ہی چھلانگ لگائی، وہ تیس پیسے اس کی مٹھی سے چھٹک کر ڈبے میں ہی گر گئے اور وہ دھچکے سے ٹرین کے

باہر جا گرا۔ٹرین اپنی پوری رفتار پکڑنے لگی تھی۔ میری نظر
بھگوان داس پر پڑی، وہ گرد جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور مایوسانہ
نگاہوں سے ریل کے ڈبے دیکھنے لگا۔میری نظر ان تین سکوں
پر جا پڑی جو اس کے الہڑ ہاتھوں نے محنت سے کمائے تھے، جن
پر بھگوان داس، اس کی ماں اور بہن کا فاقہ کھلتا۔ریل اب دور
اپنی رفتار سے ہوا کا سینہ چیرتی جا رہی تھی اور میرے کانوں میں
اب بھی بھگوان داس کی معصوم زبان سے نکلنے والے
الفاظ ''بوٹ پالش'' گونج رہے تھے۔''

عبدالسلام بہار نے افسانوں کے علاوہ عمدہ مضامین بھی لکھے ہیں مثلاً ''اردو زبان اور تعلیمی رجحان پر ایک نظر''۔اس قسم کے افسانے اور مضامین اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین میں معاون ہیں۔

نمونہ تحریر

بوٹ پالش

ایک چھوٹی عمر کا لڑکا پھٹے پرانے کپڑے پہنے لمبے لمبے بال، مگر پریشان چہرے پر زمانے کی داستان غم لئے ٹرین میں داخل ہوا۔اس کے خشک ہونٹ بھوک اور پیاس کی علامت تھے،اس کے چہرے سے حسرت ویاس کے مٹتے ہوئے نشان دکھائی دے رہے تھے۔اس کی اندرونی کشمکش اس کے چہرے سے عیاں تھی ،لیکن اس کی زبان طوطے کی طرح چل رہی تھی۔''بوٹ پالش۔شیشے کی طرح چمکائے گا۔کریم پالش کرے گا۔''اس نے سب باتیں ایک ہی سانس میں کہ ڈالیں۔اس کی آنکھوں سے بے کسی اور مفلسی وناداری کے آثار ٹپک رہے تھے۔

یہ بھگوان داس تھا، جسے باپ چند سال پہلے بے سہارا چھوڑ گیا تھا۔اب اس کے پاس ماں اور ایک بہن کا ذریعہ ُمعاش صرف یہی دس پیسے میں بوٹ پالش تھا۔وہ کونے میں مایوس صورت بنائے کھڑا تھا۔پھر بائیں جانب گھومتے ہوئے وہی آواز دی۔''بابو جی ، پالش کرے گا۔بوٹ پالش''۔اس کی آواز میں ایک خاص درد معلوم ہوتا تھا، میں نے اپنے بوٹ کی طرف اشارہ کیا۔بھگوان داس نے جلدی سے ایک پھٹا بیگ کھولا اور ایک پرانہ برش نکال کر جلدی جلدی بوٹ کی گرد جھاڑنے لگا۔ٹرین کا انجن دھک دھک کرنے لگا اور دھواں تیزی سے اٹھ کر فضا کی بلندیوں میں اڑنے لگا۔میری نظر اس کے پھرتیلے ہاتھوں پر لگی ہوئی تھی جو بوٹ پر فنکارانہ اعتماد کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔اتنے میں وہ بولا''بابو جی دیکھو بوٹ چمک گیا۔''میں نے دس پیسے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دئے۔میرے ساتھیوں نے بھی اپنے بوٹ پالش کے لئے آگے بڑھا دئے۔اس کے دونوں ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ٹرین نے پہلی سیٹی

بجائی۔ سواریاں ٹرین میں داخل ہونے لگیں۔ بھگوان داس کے چہرے سے پسینہ بہ رہا تھا۔ شائد اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے پوری توجہ سے اس چھوٹے سے لڑکے کے اس فن کو دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''میاں کتنے پیسے کمائے آج۔؟'' اس کی مایوس نگاہیں اوپر اٹھیں اور ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ '' آج کچھ نہ کمایا جاسکا، صرف یہ تیس پیسے ہیں۔ مجھے آج صبح سے ہی پولس سپاہی نے پکڑ رکھا تھا۔ بہت مارا، سارا جسم درد کر رہا ہے۔ میں غلطی سے ایک یارڈ میں داخل ہو گیا تھا، بابو جی ابھی بھی بھوکا ہوں۔''

ٹرین تیزی سے سیٹیاں بجانے لگی، سواریاں اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکی تھیں۔ چار بج چکے تھے۔ ٹرین آہستہ آہستہ سرکنے لگی تھی، بھگوان داس تیسرے بوٹ کو چمکانے میں مشغول تھا۔ ٹرین تیز ہونے لگی، بھگوان داس جلدی میں دروازے سے نیچے اترنے لگا۔ اس نے جوں ہی چھلانگ لگائی، وہ تیس پیسے اس کی مٹھی سے چھٹک کر ڈبے میں ہی گر گئے اور وہ دھچکے سے ٹرین کے باہر جا گرا۔ ٹرین اپنی پوری رفتار پکڑنے لگی تھی۔ میری نظر بھگوان داس پر پڑی، وہ گرد جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور مایوسانہ نگاہوں سے ریل کے ڈبے دیکھنے لگا۔ میری نظر ان تین سکوں پر جا پڑی جو اس کے الہڑ ہاتھوں نے محنت سے کمائے تھے، جن پر بھگوان داس، اس کی ماں اور بہن کا فاقہ کھلتا۔ ریل اب دور اپنی رفتار سے ہوا کا سینہ چیرتی جا رہی تھی اور میرے کانوں میں اب بھی بھگوان داس کی معصوم زبان سے نکلنے والے الفاظ ''بوٹ پالش'' گونج رہے تھے۔

نمونہ کلام

نام: محمد عمر فرحت

قلمی نام: عمر فرحت

ولدیت: منظور احمد ملک

پیدائش: یکم مارچ ۱۹۸۶ء، راجوری

تعلیم: بی۔اے۔

تصنیف: نراکار (ناولٹ)

ادارت: سہ ماہی تفہیم

پتہ: Near I.T.I Ward No.4 Rajouri

موبائل: 9055141889

غزل

رستے سے ہٹا دیا گیا ہوں
گھر تھا، سو گرا دیا گیا ہوں

صدیوں سے مثال نقش دیوار
تھا، اب مٹا دیا گیا ہوں

اب جا کے مجھے خبر ہوئی ہے
میں کب کا گنوا دیا گیا ہوں

اے زندہ دلانے شہر! سنئے
خاموش کرا دیا گیا ہوں

میں راگ تھا اور ہی سمے کا
بے وقت سنا دیا گیا ہوں

کیا بات ہوئی کہ اس جنم میں
انساں بنا دیا گیا ہوں

میں آگ بجھا رہا تھا فرحت
سو زندہ جلا دیا گیا ہوں

عمر فرحت

عمر فرحت سے اردو ادب کو دو فائدے ہوئے ہیں۔ایک تو خطہ پیر پنچال میں موجود ادبی کتب ورسائل سے تعلق رکھتا ہے کہ انہوں نے ایک اعلیٰ معیاری سہ ماہی رسالہ ''تفہیم'' جاری کیا ہوا ہے جو ملک و بیرون ملک اپنے اشاعتی مواد کے حوالے سے توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔اس رسالے میں بالخصوص پاکستان کے اردو ادب سے متعلق ایسے نادر نام اور ان کی تخلیقات سامنے آتی ہیں، جن تک رسائی ''تفہیم'' کی اشاعت سے قبل ممکن نہ تھی۔اور اس طرح یہاں کے جو نام ان کے رسالے کی زینت بنتے ہیں، وہ بھی پاکستان اور دیگر غیر ممالک میں توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ بہت سی پاکستانی کتب اور رسائل جو ''تفہیم'' کی اشاعت سے پہلے موصول نہ ہوتے تھے ،اب مطالعے کا حصہ بن جاتے ہیں۔عمر فرحت کی ہندوستان کے بھی بڑے بڑے ناموں تک رسائی ہے۔ادارہ شب خون کی بہت سی کتابیں ان کے پاس موجود ہیں۔ اردو ادب کے دیگر بڑے نام بھی ان کو عزیز رکھتے ہیں اور اپنی اہم کتابیں بھیجتے رہتے ہیں۔ یہ عمر فرحت کا ہی کارنامہ ہے کہ پاکستان اور دیگر ممالک کے شعرا و ادبا سے بالعموم ''تفہیم'' کے قارئین اور بالخصوص خطہ پیر پنچال کے اہل ادب کے مراسم استوار ہوئے ہیں اور ''تفہیم'' قلیل مدت میں ہی ان رسائل کی صف میں شامل ہو گیا ہے جہاں خصوصی طور پر پاکستان سے تعلق رکھنے والے تخلیق کاروں کے مواد پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔

''تفہیم'' نے اپنی اشاعت کی قلیل مدت میں کئی اہم گوشے بھی شایع کئے ہیں، جن میں نیر مسعود پر شامل گوشہ بہت معیاری اور ان کو بہترین خراج تحسین ہے۔ادارہ ''تفہیم'' نے کئی اہم کتابیں بھی شایع کی ہیں، جن میں ہندوستان اور پاکستان دونوں طرف کے تخلیق کاروں کی کتابیں شامل ہیں۔عمر فرحت جس تندہی سے ادب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ،اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نوجوان خطہ پیر پنچال کے بہترین اردو کے خدمت گاروں کی صف میں اپنا شمار کرانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

عمر فرحت کا تخلیقی رجحان نثر کی بہ نسبت نظم بالخصوص غزل گوئی کی جانب زیادہ ہے۔ان کے اشعار سے ان کے نئی شاعری کے گہرے مطالعے سے دلچسپی کا اظہار ملتا ہے۔ چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

لفظ لفظ آنکھوں میں
حرف حرف بھیگا ہوں

نیند نیند لمحوں میں
جاگ جاگ سویا ہوں

ہجر ہجر صحرا میں
ریت ریت پھیلا ہوں

اس قسم کے اشعار واضح کرتے ہیں کہ عمر فرحت غزل کے علامتی اور استعاراتی نظام سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ان کے اشعار میں رومانیت اور حسن وعشق کی واردات نہ کے برابر اور سماجی نشیب وفراز اور اس سے پیدا شدہ طبقاتی کشمکش اور اس کے انسانوں کے ذہن و دل پر اثرات جس قسم کی سماجی گھٹن اور بے راہ اوی کو راہ دیتے ہیں، وہ ان کی شاعری میں موجود ہے۔اختر اورینوی کے الفاظ یاد آتے ہیں۔

''میں ادب وشعر کی تخلیق میں سماجی میلانات اور ماحول کی معروضیت اور مزاج کی اہمیت کو آج بھی تسلیم کرتا ہوں، لیکن اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس عمل میں انفرادی قوت تخلیق

وتعمیر کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔'' (جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، از۔ڈاکٹر شارب رودولوی، ص، ۴۰۷)

عمر فرحت نے اپنی انفرادی قوت تخلیق وتعمیر کی اہمیت کواجاگر کرتے ہوئے جواشعار کہے ہیں، وہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ چند اشعار

ایک لمحے کو رک گیا تھا وقت
ایک لمحے کو مر گیا تھا میں

پاؤں مرے برف ہو گئے
تھے
در تو اس کا کھلا ہوا تھا

جس وقت وہ گل کھلا ہوا تھا
میں مسئلوں میں گھرا ہوا تھا

تالو سے زباں چپک رہی تھی
اشکوں میں لہو ملا ہوا تھا

مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے کہ عمر فرحت کی تخلیقی اڑان فرحت بخش ہے۔ اگر وہ اسی طور تخلیقی محنت کرتے رہے تو ادب میں اپنی بہترین شناخت قائم کرسکتے ہیں۔

نمونہ کلام

نام: عرفان علی
قلمی نام: عرفان عارف
ولدیت: غلام اکبر وار
پیدائش: ۲۱، مئی ۱۹۷۷ء پونچھ
تعلیم: ایم۔اے (اردو) نیٹ
پیشہ: اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
تصانیف: دور افق سے پار (شعری مجموعہ)
فن تدریس اردو
آؤ اردو سیکھیں
شعریات
کہکشان ادب
پتہ: House No. 75 Ward No.7
main Poonch Tahseel
Haveli Poonch
موبائل: 9858225560

غزل

خوش نما منظر یہاں کوئی نہیں
خوشبوؤں کا گھر یہاں کوئی نہیں

کس کے سر رکھیں کلاہ فخر ہم
جب مقدس سر یہاں کوئی نہیں

قاتلوں کے شہر میں رہتے ہو، واہ!
ہاتھ مین خنجر یہاں کوئی نہیں

ٹوٹ کر بکھرے پڑے ہیں آئینے
دور تک پتھر یہاں کوئی نہیں

کس جگہ سجدے کو پیشانی جھکے
اس طرح کا در یہاں کوئی نہیں

لوٹ کر آئے بھی کیا عارف میاں
گاؤں ہے، پر گھر یہاں کوئی نہیں

عرفان عارف

عرفان عارف کا شعر ہے ۔

دکھ سکھ کے ہر روز صحیفے لکھتا ہوں
اپنی ذات کے آپ قصیدے لکھتا ہوں

اگر اس شعر کے آئینے میں عرفان عارف کے شعری نقطہ ہائے نظریات پر غور کیا جائے تو اپنی ذات سے کائنات کا سفر کرنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے آپ قصیدے لکھنے کا مطلب جدید انسان کی عظمتوں کے اعتراف سے ہے جن کے سکھ دکھ سے عہد حاضر میں کائنات میں کشش کا ایک جدا رنگ پیدا ہو گیا ہے جو اس سے پہلے نہیں تھا۔ نئی نئی ایجادات اور زندگی کے بدلتے ہوئے طرز نے یہ صورت پیدا کی ہے۔ اس میں ذہنی اور تہذیبی زندگی کے خاکے کے کئی رنگ شامل ہیں جو طرز فکر اور عقلیت کے متوازی میلان کا تقاضا کرتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ''ادب اور زندگی'' کے متعلق خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا:

> ''انسان کی بحیثیت انسان، دو خصوصیتیں ہیں جو اسے دوسرے حیوانوں سے ممیز کرتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ اوزار بنا سکا جن کے وسیلے سے اس نے قدرت کی قوتوں کو معیشت اور اپنے تحفظ کے لیے استعمال کرنا سیکھا۔ دوسری یہ کہ اوزار بنانے اور کام کرنے کے دوران میں اپنی جبلی صداؤں کو زبان کی شکل میں بدل سکا، اور اپنا مطلب اور مفہوم ادا کرنے کے لیے اور انسانی زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کے اظہار کے لیے بامعنی الفاظ اور جملوں کا اختراع کر سکا۔۔۔۔۔۔ایسے ماحول میں انسان نے لفظوں کی طلسمی کیفیت محسوس کی۔ لفظ، جو شعور اور معنی، تخیل اور فکر کا صوتی اظہار تھے، اسم اعظم تھے۔ جس کے دہرانے سے اپنے ماحول اور حالات زندگی اور جہد حیات پر قدرت حاصل کرنے

کے لیے نفسیاتی، ذہنی اور روحانی طور پر وہ اپنے کو زیادہ مضبوط اور طاقت ور بنا سکتا تھا۔"

(بحوالہ معاصر تنقیدی رویے، از ابوالکلام قاسمی، ص ر ۱۵۳)

ظاہر ہے کہ انسان نے خود کو نفسیاتی، ذہنی اور رومانی طور پر نہ سہی، مادی معاملات اور دوسرے میدانوں میں خود کو زیادہ مضبوط اور طاقتور بنایا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں بقول عرفان عارف ؎

دل کے ایک اشارے پر
میں کیا کچھ کر جاتا ہوں

والے نقاط بھی پلتے رہے۔ اور آج عہد حاضر میں انسانی تقاضے اور اس کے لوازمات ہمارے سامنے ہیں۔ عرفان عارف کے مزید اشعار ؎

بس اس خیال سے رہی ہمارے بیچ دوستی
کہ مرحلۂ عشق میں جہاں کی فکر کیوں کریں

ڈھلتے ہی آفتاب کے ڈھلنے لگا ہوں میں
بن کے چراغ راہ کا جلنے لگا ہوں میں

آئینے کے سامنے جب گفتگو کرتے رہے
اک نئے چہرے کی ہم بھی جستجو کرتے رہے

کس کے سر رکھیں قلاحِ فخر ہم
جب مقدس سر یہاں کوئی نہیں

جو نیندوں کا سوداگر ہے
وہ کب چین سے سوسکتا ہے

عرفان عارف کے مندرجہ بالا اشعار انسانی تجربوں اور اقدار کے بارے میں وہ ضابطہ جمالیاتی طور پر فراہم کرتے ہیں جن کا تعلق موجودہ عہد کی ذہنی فضا اور اس میں مضمر زندگی کرنے کے فلسفوں سے ہے۔عرفان عارف نے اپنے اشعار میں جذبیہ، عقلیہ اور فکریہ عناصر سے ازلی اور ابدی مسائل کو اپنے مخصوص تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کی شعری آگہی نے اقدار کی روشنی میں ان کو محض چند واقعات سے متاثر ہو کر شخصیت کو پارہ پارہ کر دینے والے احساس سے دور رکھا ہے۔ یہ دوری انہیں مکمل وجود کی تلاش میں سرگرم عمل رکھتی ہے اور اس کا احاطہ کرنے کی دعوت فکر دیتی ہے ۔

میرا لفظ لفظ ہے معتبر
ہاں میں زندگی کا نصاب ہوں

جو رئیس تھا ترے خواب میں
میں وہی ہوں، خانہ خراب ہوں

ایسی چلی ہیں اب کہ ہوائیں نفاق کی
اپنوں نے دیکھو اپنوں کے سر کاٹ دیے ہیں

آ جاتی ہے منزل، ابھی بس آتی ہی ہوگی
ان جھوٹی امیدوں نے سفر کاٹ دیے ہیں

بے مول بہا کرتے ہیں، پر کم نہ سمجھنا
ان اشکوں نے پتھر کے جگر کاٹ دیے ہیں

احتشام حسین نے ادب اور اس کے مطالعے کے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے:

''ادب کا مطالعہ سیدھے سادے طریقے پر شروع ہوتا ہے، لیکن پڑھنے والا جس قدر لکھنے والے کے جذبات اور خیالات، تجربات

اور افکار میں شریک ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کا مطالعہ معنی خیز ہوتا جاتا
ہے۔ یہ معنی خیزی مختلف سطحیں رکھتی ہیں۔ کسی کے لیے لذت اندوزی اور
جمالیاتی حظ کی منزل پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے، کسی کے لیے توسیع شعور اور
علم کا ذریعہ بنتی ہے، کسی کے لیے اس سے محض جذبے کی تحریک ہوتی ہے،
کسی کے لیے معلومات کا ذریعہ بنتی ہے، شعر و ادب کے مطالعے سے معنی
تو ہر شخص اخذ کرتا ہے لیکن اس کی نوعتیں مختلف ہوتی ہیں۔''

یہاں میں اتنا اور عرض کروں گا کہ قاری سیدھے سادے مطالعے سے آگے اسی ادب کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا جس ادب میں قاری کو سیدھے سادے مطالعے سے آگے متاثر کرنے کی قوت ہوگی۔ عرفان عارف کے یہاں یہ قوت موجود ہے۔ وہ جو تخلیقی ادب پیش کر رہے ہیں، وہ اہم اس لیے بھی ہے کہ موجودہ عہد کی فضا کا مشاہدہ کرتے ہوئے جو نتیجہ انہوں نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے، وہ کافی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

طوفاں کی زد ہے، روز سفینے ہیں زیر آب
ائے زندگی! تیرا کوئی ساحل نہیں رہا

نمونۂ کلام

نام: ڈاکٹر فاروق خان مغل

قلمی نام: پرواز

ولدیت: جہانگیر خان

پیدائش: دوم مئی ۱۹۷۱ء

تعلیم: ایم۔ایس۔سی۔پی ایچ ڈی

پیشہ: ملازمت (AIIMS)

ذریعۂ اظہار: اردو، پہاڑی

پتہ: Ghaffar Manzil Street

3 Okhla Jamia Nagar

New Delhi

موبائل:

غزل

نہیں تھا کچھ بھی مری جان تشنگی کے بغیر
مرے وجود میں لیکن کبھی کبھی کے بغیر

مرا سخن ،مرا لہجہ ،ہزار معنی ہے
مرے کہے پہ نہ جا، میری ان کہی کے بغیر

ذرا سی بات پہ دنیا سے روٹھ جاؤں گا
پھر اس کے بعد میں جی لوں گا ،زندگی کے بغیر

کوئی بھی مجھ میں ابھی لوٹ کر نہیں آیا
الجھ رہا ہوں اندھیروں سے روشنی کے بغیر

میں ایک ذات کو محسوس کرتا رہتا ہوں
کبھی کسی کے علاوہ، کبھی کسی کے بغیر

میں جانتا ہوں کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا
کہ ایک عمر گزاری ہے آگہی کے بغیر

ڈاکٹر فاروق مغل پرواز

ڈاکٹر فاروق مغل پرواز کی شاعری کے مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے کہ ان کی ہر فکر ایک مخصوص صورت حال سے جلا پاتے ہوئے، اس کے زمانی و مکانی انسلکات سے فیض اٹھاتے ہوئے، اس کے اصل جوہر کی وسیع معنویت کو روشن کرتی ہے۔اور لمحاتی صداقتوں میں آفاقی صداقتوں کے امکانات تلاشتی ہے۔ان کی شاعری میں وجودیت پر جو زیادہ زور ہے، میرے خیال میں جدیدیت کے رجحان کا مرہون منت ہے۔اس رجحان میں ظاہر ہے کہ ابہام اور استعارہ سازی سے زیادہ کام لیا گیا۔اور فاروق مغل پرواز نے تو خود کہا ہے۔

مرا سخن، مرا لہجہ ، ہزار معنی ہے
مرے کہے پہ نہ جا، میری ان کہی کے بغیر

اس قسم کے اشعار غالباً جدید رجحان کے بڑے شعرا سے متاثر ہو کر کہے گئے محسوس ہوتے ہیں۔جیسا کہ محمد علوی نے کہا ہے۔

باتیں کہی کہی سی ہیں
پھر بھی نئی نئی سی ہیں

یا پھر بانی۔

شاعری کیا ہے کہ اک عمر گزاری ہم نے
چند الفاظ کو امکان و اثر دینے میں

یا پھر ناصر کاظمی۔

میری نوائیں الگ، میری صدائیں الگ
میرے لئے آسماں، سب سے جدا چاہئے

اسی الگ شناخت کے سلسلے کے کچھ ایسے اشعار فاروق مغل پرواز کی قلم سے نکلے ہیں جوان کے مختلف ہونے کی ضمانت دیتے ہیں۔مثال کے طور پر۔

ذرا سی بات پہ دنیا سے روٹھ جاؤں گا
پھر اس کے بعد میں جی لوں گا، زندگی کے بغیر

کوئی بھی مجھ میں ابھی لوٹ کر نہیں آیا
الجھ رہا ہوں اندھیروں سے روشنی کے بغیر

پہلا شعر دوسرے شعر کی بہ نسبت کم پیچیدہ ہے جس پر تھوڑی غور وفکر کر کے کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے، لیکن دوسرا شعر تفہیم کے سلسلے میں زیادہ عرق ریزی مانگتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ زیادہ غور وفکر کا مطالبہ کرتا ہے۔یہیں سے یہ نقطہ بھی نکلتا ہے کہ اس قدر اجنبی پن کی کیا ضرورت پیش آئی ۔اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اسے احساس اجنبیت ہے، اس لئے شاعر اپنے انداز اور اسلوب میں اس کو برتتا ہے، اور پھر یہ شاعر کا مسئلہ ہے بھی نہیں اس کا کام اپنے پسندیدہ لہجے میں اپنی بات پہنچا دینا ہے اور بس۔ پروفیسر شمیم حنفی نے احساس اجنبیت کے تعلق سے بڑی عمدہ بات کہی ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''احساس اجنبیت Alienation کا مسئلہ بھی اسی تہذیبی ابتری سے مربوط ہے۔گرد وپیش کی زندگی سے لاتعلقی کی خواہش یا بیزاری اور برہمی کا اظہار واحساس نئی شاعری میں معاشرے کے انتشار کا ردعمل ہے۔اشترا کی حقیقت نگاری اس جاں گداز احساس اجنبیت کو فرضی بتاتی ہے یا زندگی کی سچائیوں سے فرار وانکار کا نتیجہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اجنبیت کی اصطلاح ہیگل نے وضع کی تھیہ اور اسے ایک نفسیاتی اور عمرانی

تناظر میں استعمال کیا تھا۔ مارکس نے اس اصطلاح کو سیاسی اور
تہذیبی معنویت بخشی اور اسے صرف سیاسی مسائل تک محدود
رکھنے کے بجائے انسان اور اس کی عملی زندگی یا اس کے معاشرتی
روابط کی باہمی آویزش کے آئینے میں دیکھا۔ اس کے نزدیک
احساس اجنبیت کی نمود کا اصل سبب یہ ہے کہ مزدور اپنی محنت کی
پیداوار سے یوں منسلک ہوتا ہے گویا کسی اجنبی شئے سے، کیوں
کہ اس کی تقسیم کی نوعیتیں اور تخلیق کے مقاصد ناقص ہیں۔ یعنی
اپنی ہی آفریدہ حقیقت دوسروں کے تسلط اور غلبے کے باعث
اس کے لئے اجنبی بن جاتی ہے اور جذباتی رشتوں کا فقدان
اسے اپنی ہی دنیا میں بیگانہ بنا دیتا ہے۔''

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از۔ شمیم حنفی، ص، ۲۷۵)

جذباتی رشتوں کے اسی فقدان کا یہ احساس اور اس کے انسلاکات مختلف موضوعات کی
صورت میں فاروق مغل پرواز کی شاعری میں در آئے ہیں، جیسا کہ یہ شعر۔

رات کے پچھلے پہر مجھ میں کوئی ڈر جاگے
جاگتا ہے تو مری جان مکرر جاگے

شعر پر غور کرنے سے سوال ابھرتا ہے کہ ''مری جان'' کا استعمال بتاتا ہے کہ متکلم
اپنے سب سے معتمد ساتھی کے ساتھ ہے لیکن رات کے پچھلے پہر جو کہ نیند کی آغوش کا سب سے
موثر وقت مانا جاتا ہے، میں کسی ڈر کا جاگنا اور اس کے بعد محبوب کی موجودگی میں اس کا مسلسل
جاگتے رہنے کا سبب جو ڈر ہے، کہیں وہ اجنبیت کا ڈر تو نہیں ہے۔؟ اس طرح منظر پس منظر کے
بہت سے اشعار فاروق مغل پرواز کے یہاں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آنکھ کھل جائے تو بدلی ہوئی دنیا دیکھوں
بند آنکھوں میں وہی روز کا منظر جاگے

دیکھ کر لفظ پس لفظ صداؤں کا سکوت
زرد ہونٹوں پہ کسی بول کا منتر جاگے

آج کی رات کوئی ہار نہ مانے خود سے
آج کی رات کوئی اپنے برابر جاگے

یا کوئی بات مرے سایۂ در اصل سے ہو
یا بھنور سیپ میں امید کا گوہر جاگے

اب کے ہاتھوں سے مرے کاش لکیریں پھسلیں
اور مجھ سا کوئی دن رات میں بڑھ کر جاگے

صنعتی معاشرے کی ذاتی حرص وہوس نے مغرب پر ایک طرح سے پورا قبضہ جمانے کے بعد مشرق کا رخ کیا اور یہاں بھی اپنے ہاتھ پاؤں پھیلاتے ہوئے اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ سماجی رشتوں کا مفہوم بھی درحقیقت اب زیادہ تر ایک مادی سود وزیاں کے رشتے کے دائروں میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ فاروق مغل پرواز کی شاعری میں اس تلخ حقیقت کی آئینہ داری بہت موثر طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

نمونہ کلام

غزل

نام: عبدالرشید نائیک

قلمی نام: فدا راجوروی

ولدیت: عبدالسبحان نائیک

پیدائش: یکم جنوری 1962 پوشانہ

تحصیل سرنکوٹ، پونچھ

تعلیم: ایم۔اے (اردو، سیاسیات)۔بی

۔ایڈ

ذریعہ اظہار: اردو، کشمیری، گوجری

پیشہ: ریٹائرڈ پرنسپل، ہائر سکینڈری

موجودہ پتہ: Bahrot Thanna

Mandi Rajouri

نمونہ کلام

غزل

سو قربتوں کے بعد بھی سو فاصلے رہے
کچھ اس طرح دلوں میں حوادث پلے رہے

آنا نہ تھا کسی کو، نہ آیا کوئی ادھر
ویران راہ تکتے سبھی راستے رہے

اپنی بھی ہو سکی نہ کبھی کائنات دل
بے سمتیوں کی نذر سبھی واسطے رہے

کس کو پڑی ہے آ کے سنے کچھ دلوں کی بات
ہے کون جس کو دل کے یہاں ولولے رہے

دنیا عجیب شہر ہے، چلتا ہے سب یہاں
سب لوگ اپنی فکر و نظر بانٹتے رہے

گو مدتوں کی راہ چلا تھا بصد خلوص
سب خواب میرے راہ میں بکھرے پڑے ملے

میری طرح نہ راہ میں کوئی لٹے فدا
بکھرا کچھ ایسے، سارے نشانے دھرے رہے

فدا راجوروی

شمس الرحمن فاروقی نے نو آبادیاتی فکر کے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے:

''نو آبادیاتی فکر کے سب سے بڑے ترجمان ہمارے اقبال ہیں۔ یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے ہمیں سکھایا کہ مغربی فکر اور تہذیب سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کی کمزوریوں اور نارسائیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اقبال نے ہمیں بتایا کہ مغرب نے ہمارا فکری اور تہذیبی استحصال کیا ہے۔ اقبال نے مشرق کو محض تاریخ پارینہ کی طرح نہیں بلکہ زندہ وجود کے طور پر دیکھنے کی تلقین کی۔'' (بحوالہ معاصر تنقیدی رویے، ابوالکلام قاسمی ص/۲۱)

فدا راجوروی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اقبال سے پوری طرح متفق نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مشرقیت کی آئینہ داری بہت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ یعنی ان کی شاعری میں مشرقی تہذیب وتمدن کے تقریباً سبھی رنگ نظر آتے ہیں۔ جہاں جہاں انہوں نے اپنے اشعار سے طنز کا کام لیا ہے وہاں بھی مشرقی لب ولہجہ پوری طرح نمایاں ہے ؎

یہ خلائی سرحدوں کا دور ہے
مختصر نظروں سے یوں دیکھا نہ کر

خامشی یا گفتگو کا سلسلہ
ہر گناہ کے بعد پھر اک حوصلہ

ہم کلامی تھی در و دیوار سے
گھر میں اپنے ہم زباں کوئی نہ تھا

یہ الگ ہے، ہم نہ سمجھے خامشی کی داستاں
بولتا گمنام آذر ہر کسی پتھر میں تھا

گمرہی میں تراشنا راہیں
منزلوں کے گماں میں رہنا

فدا راجوروی کے یہاں جن حقائق کی تصویر کشی کی گئی ہے ان میں نئے خیالات اور صیغۂ اظہار کے نئے رنگوں کی آمیزش تو نہیں ملتی جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا لیکن ان کے تخلیقی ابعاد کی جڑیں اپنی مشرقی زمین میں اس قدر پیوست ہیں کہ زبان اور خیال میں مدغم ہو کر جمالیاتی معیار و مطالبے پر پوری اترتی ہیں۔ ذاتی تجربات کے میدان میں بھی ان کے یہاں شعری تجربہ موضوع بن کر حقیقت کا سرا تخلیقی عمل سے مربوط کر دیتا ہے۔ جسے کرشنا مورتی نے تہذیبی قدروں میں تبدیلی کے مسئلے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''جب ذہن اپنے گرد و پیش کے معاشرتی نظام کے خلاف احتجاج کرتا ہے، اس وقت یہی احتجاج عملاً ایک نئے اور بہتر اور بدلتے ہوئے تہذیبی نظام کی بنا ڈالتا ہے۔'' (بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، شمیم حنفی، ص/۵۱)

غور کیا جائے تو فدا راجوروی کے اشعار لاشعوری طور پر ہی سہی اس احتجاج کا ایک عملی حصہ ضرور بن جاتے ہیں جو نئے، بہتر اور بدلتے ہوئے تہذیبی نظام کی بنا ڈالتا ہے۔

ہم کلامی ہوگی صدیوں کی نصیب
پتھروں سے جب صدا آ جائے گی

میرے خوابوں کو خلا کے پار رکھ جاتا ہے کون
روز گردن پر نئی تلوار رکھ جاتا ہے کون

ابال آئے گا پھر ہوا میں
ابھی دریچے یہ بند رکھنا

سمندر نے جسے چاہا ڈبونا
ہواؤں نے وہی بستی بچالی

شہر دل میں رہ گزر ممکن نہیں
ہر کسی کا ہو یہ گھر، ممکن نہیں

فدا راجوروی نے نئے انسان کی سماجی ضرورتوں کے تحت جذباتی اور حسی تقاضوں کو اپنے اشعار میں جگہ دی ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پوری مشرقیت کے ساتھ۔ دراصل تہذیبی مسائل یا دوسرے اقسام کے مسائل کے رشتے بھی وقت کے ایک وسیع تصور سے منسلک ہوتے ہیں۔ انہیں ماضی سے بے گانہ کر کے محض حال کے تجزیے کی بنا پر پوری طرح سمجھا اور پرکھا نہیں جاسکتا۔ جب تک کسی چیز کی جڑ یا بنیاد تلاش نہ کرلی جائے، اس پر غور وخوض نہ کرلیا جائے تو آگے کے مراحل کس طرح کامیابی سے طے کیے جاسکتے ہیں۔ تو جڑ اور بنیاد تو بہر حال ماضی ہی ہے۔ فدا راجوروی کے یہاں جبر اور مادی مفاد کے تناظر میں موجود مصنوعی ارتقا کے عمل کے خلاف کہ جس کی انتہا ادبی اور سماجی اقدار کی پسپائی کے علاوہ کچھ نہیں، شدید احتجاج ملتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مغربی مثبت ادبی فلسفوں اور اقدار کو مشرقیت کے تناظر میں چھان پھٹک کر اپنانے کے حامی ہیں۔

وفا پر جو کبھی پوری نہ اترے
وہی تجدید پیماں دیکھتا ہوں

اب جگنوؤں کی دھوپ نہیں کالی رات میں
شاید بپا ہے قحط کوئی کائنات میں

دیوانے بنتے تھے خواب
اب سب نے اپنا لی رات

قدم بہکے ہوئے الجھی ہوئی چال
مسافر بھیڑ میں ہی کھو گیا ہے

تھے سب اسی تلاش میں لیکن الگ الگ
سب کھوجتے تھے راستے اپنے عجیب سے

فدا راجوروی کے اشعار میں عام تباہی اور بربادی کا فطری ردعمل داخلی ہیجان کی صورت میں فن کی حیثیت سے سامنے آتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں جب تک ان کا یہ داخلی ہیجان برقرار رہے گا، ان کی تخلیقات بھی اردو ادب کو روشن اور منور کرتی رہیں گی۔

نمونہ کلام

نام: محمد فاروق

قلمی نام: فاروق مضطر

ولدیت: عبدالعزیز وانی

پیدائش: ۱۴، اپریل ۱۹۵۴ء، تھنہ منڈی راجوری

تعلیم: ایم۔اے۔(اردو، گولڈ میڈلسٹ)

پیشہ: ریٹائرڈ پرنسپل

ادارت: ماہنامہ ''دھنک''

پتہ: Himalayan Education Mission Society Ward No.9 Rajouri

موبائل: 9419170905

غزل

نقش آخر آپ اپنا حادثہ ہو جائے گا
اور طے وہم و یقیں کا مرحلہ ہو جائے گا!

گونج اٹھیں گے در و دیوار اپنے کرب سے
لفظ، جو تشنہ ہے، معنی آشنا ہو جائے گا!

جسم بھی پگھلیں گے، سائے بھی نہ ٹھہریں گے کبھی
جانے کب یہ سبز منظر بھی ہوا ہو جائے گا

لوگ سب اس کی کہانی جان لیں گے حرف حرف!
اور وہ خوش پوش کھل کر بے ردا ہو جائے گا

پیڑ اگلیں گے سیاہی کا سمندر دیکھنا!
موسم خوش رنگ مضطر، زخم پا ہو جائے گا

فاروق مضطر

فاروق مضطر اردو شعر و ادب کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب تحریک اور رجحان کے اعتبار سے اردو ادب بڑی اہم تبدیلیوں سے دوچار ہو رہا تھا۔ ۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے درمیان اور اس کے بعد بھی جن سخنوروں کا زمانۂ حال اور اس کی حقیقت سے واسطہ رہا، ان کی شاعری میں یکسر تبدیلی کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

فاروق مضطر کا زمانہ وہ ہے جب ہندوستان میں سوغات، شب خون، الفاظ وغیرہ اور پاکستان میں اوراق وغیرہ کی قبیل کے رسائل اہل ادب کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ شعر کہنے کے لیے شعرا کا منفرد الفاظ کا انتخاب اور اس کو برتنے کا رویہ اپنی ایک الگ نوعیت رکھتا تھا۔ فاروق مضطر کی شعری حسیت پر بھی اس کا اثر ہوا اور ان کے قلم سے جو اشعار نکلے، ان میں سے چند ذیل میں درج ہیں۔

مگر ان آنکھوں میں کس صبح کے اجالے تھے
ہمارے نام کے سارے حروف کالے تھے

یہ خاک و باد، یہ ظلمات و نور، بحر و بر
کتاب جاں میں یہ کس ذات کے حوالے تھے

ہے رنگ رنگ مگر آفتاب آئینہ
جبین شب پہ تو لکھے سوال کالے تھے

سوچ بھی اس دن کو جب تو نے مجھے سوچا نہ تھا
کوئی دریا، دشت کے اطراف میں بہتا نہ تھا

اس کو کب فرصت تھی جو چہروں کو پڑھتا غور سے
ورنہ سطح آئینہ کا ہر ورق سادہ نہ تھا

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ ان میں جدید نظریاتی رشتوں کو تقویت دی گئی ہے اور وہ رجحان جو جدیدیت کے رجحان سے موسوم ہے، ان اشعار میں جہاں ان کی تشہیر کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے، وہیں جدیدیت کے اہم نظریات مثلاً احساس شکست، ذاتی کرب، وجودیت، انفرادیت وغیرہ کے زیر سایہ ان کی شاعری کے پروان چڑھنے کا بھی سراغ ملتا ہے۔ لیکن جب ہم ان کے موضوعات اور طریق کار کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں تو اسلوبیاتی رویوں کے جدیدیت کے خاکے میں سمانے کے باوجود ان میں دیگر روایات اور رجحانات کی مشترک قدریں مثلاً صداقت، حسن اور خیر کے وہ عناصر نظر آتے ہیں جن کا تعلق حقائق کی تلاش و تحقیق سے ہے۔ فاروق مضطر زندگی کے مختلف مظاہر کی تہوں کی دریافت کے سلسلے میں عمل اور ردعمل کی سطح پر اپنی شعری شخصیت کو تخلیقی قوت میں جذب کر دیتے ہیں۔ پھر ان سے جو پیکر بنتے ہیں، وہ ان کے اشعار کی قدر و قیمت کا احساس بخوبی کراتے ہیں۔

شاہراہوں سے گریزاں ہے، مگر کچھ سوچ کر!
عادتاً پہلے تو وہ پگڈنڈیاں چلتا نہ تھا

نقش آخر آپ اپنا حادثہ ہوجائے گا
اور طے وہم و یقیں کا مرحلہ ہو جائے گا

گونج اٹھیں گے در و دیوار اپنے کرب سے
لفظ، جو تشنہ ہے معنی آشنا ہو جائے گا

پیڑ اگلیں گے سیاہی کا سمندر دیکھنا
موسم خوش رنگ مضطر زخم پا ہو جائے گا

فاروق مضطر نے عہد بہ عہد کی زندہ حقیقتوں کا انسلاک اپنے اردگرد کے ماحول سے کرنے کے لیے حقائق کے عرفان تک رسائی کی کاوشوں کو مختلف فلسفوں کی روشنی میں برتا ہے۔ یعنی جو نظریات اور فلسفے ادب اور معاشرے کی ضروریات سے مطابقت رکھتے ہیں اور بعض اوقات حقیقتوں کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل بھی ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس طرح ان میں تحرک برقرار رہتا ہے۔ نئی اور پرانی قدروں کے تصادم کے حوالے سے حسیاتی کشمکش کی جو روداد فاروق مضطر کے یہاں ملتی ہے وہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ زندگی کے دوررس اور ہمہ گیر تجربات کا تجزیہ ان کے شعری شعور کا خاص وصف ہے۔ اس طرح یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا نظریۂ شعروادب جدیدیت کے بندھے ٹکے فارمولوں سے کہیں آگے بھی اپنے سفر کو جاری رکھتا ہے۔

اجلے ماتھے پہ نام لکھ رکھیں
خواہشوں کا مقام لکھ رکھیں

پھر ہوس کو ہے حسرت پرواز
آپ دانہ و دام لکھ رکھیں

جانے کس سمت کل ہوا لے جائے
لمحۂ شاد کام لکھ رکھیں

اپنے ہونے کا کچھ یقیں کرلیں
ریت پر نقش و نام لکھ رکھیں

آنے والی اداس نسلوں کے
سلسلہ وار نام لکھ رکھیں

فاروق مضطر انسانی حقائق کو محض نظریاتی کسوٹی کی بنیاد بنا کر پیش نہیں کرتے بلکہ وہ ادبی اعتبار سے بھی قابل اعتنا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر کسی مطلق اور میکانکی تصور کی

آئینہ داری کرتے ہوئے اس سماجی اور معاشرتی ہیجان اور بحران کو بھی مدنظر رکھتے ہیں جو عہد بہ عہد پروان چڑھا اور اب تک سیاسی انتشار کے سبب تبدیلیٔ انقلاب کا منتظر ہے۔ یہ انتظار ان کی بعض نظموں میں بہت شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ ان کی ایک نظم جس کا عنوان ''اپنی آگ میں'' ہے ذیل میں درج ہے۔

''میں!
برف سے ڈھکی چٹان سے پھسل پھسل گیا
(مچل گیا)
میں لمحہ لمحہ
اک جہنمی طلب میں مبتلا
حدنگاہ
دن کی کالی کھائی تک پھسل گیا
آفتاب
اپنی آگ کے حصار میں پگھل گیا
دعا کا ہاتھ جل گیا''

(اپنی آگ میں)

فاروق مضطر اپنے موضوعات میں سماجی ماحول کا ایک تاریخی تسلسل بھی رکھتے ہیں۔ یہ تاریخی تسلسل ادبی انصاف کی سطح پر ان کے شعور و ادراک اور فن کارانہ خلوص کے زیر سایہ ان حقائق کی بھی نفی نہیں ہونے دیتا جو محض نظریاتی اختلافات کی بنیاد پر معیوب قرار دیے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا شعری تصور محض آج پر ہی زور دینے کے بجائے اس مسلسل نامیاتی عمل کا حامی ہے جو ماضی کی بہترین روایات اور نئے دور کے مطالبات کو ہم آہنگ کر کے نئی راہ کی دریافت کا قائل ہے۔ اس طرح ان کے یہاں ماضی کے ادب سے استفادہ اور ان سے بصیرت کے اخذ کا رجحان تو نظر آتا ہے لیکن روایت کے زندہ تصور کا عکس وہ مستقبل کے آئینہ خانوں میں دیکھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

ایک دن ساری کتابوں کو لپک جائے گی آگ
اور پھر اس راکھ سے اک حرف لکھا جائے گا

آگ کے لپک جانے کی معنویت پر غور کریں کہ کوئی شاعر اس کے متبادل کے طور پر نگل جائے آگ بھی استعمال میں لا سکتا تھا اور ظاہری طور پر اس میں معنی کا ایک دوسرا رخ بھی نمایاں ہو سکتا تھا۔لیکن لپک جانے میں جو برجستگی ہے اور ایک طرح کی مکمل قوت کا جو مظاہرہ ہے اور اس کے ساتھ ہی معنی کا جو سلسلہ ہے وہ 'نگل جائے گی آگ' سے برآمد نہیں ہوتا حالانکہ دیکھنے میں بھاری بھر کم لفظ 'نگل جائے گی آگ' ہی معلوم ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ایک حرف پر غور کیا جائے۔یہ ایک حرف الف بھی ہو سکتا ہے جو سنسکرت میں ''اوم'' ہے۔اور سنسکرت دنیا کی قدیم ترین زبان تصور کی جاتی ہے۔یہاں تک کہا جاتا ہے کہ دنیا کی تمام دوسری زبانوں کے سوتے سنسکرت زبان سے ہی پھوٹتے ہیں، کا پہلا حرف ا ہے، عربی میں الف اور انگریزی میں اے ہے۔اس طرح غور کیا جائے تو اس شعر میں ماضی، حال اور مستقبل کے اعتبار سے جہاں معنی آباد ہے۔اس سلسلے میں فاروق مضطر کی دو مختصر نظمیں بھی توجہ انگیز ہیں۔ایک نظم جس کا عنوان 'کتبہ' ہے۔یہ ہے:

''الجھنیں، آشفتگی۔آمادگی
رات بھر کالے سوالوں کے نگر میں گھوم پھر کر
صبح اپنے آپ میں جو لوٹ آیا
ایک بوسیدہ عمارت کا کوئی کتبہ ہے وہ!

اور اب
یوں ہی اپنے آپ میں سمٹا ہوا رہتا ہے وہ!!'' (کتبہ)

دوسری نظم کا عنوان 'نظم' ہی ہے:

''اے سبک سادہ نشاں پانی کی لہر!
اے گل امکاں خبر موج ہوا
میں۔! زیاں احساس قطرہ قطرہ رات
تو۔! سفر، ساکت سمندر، دائرہ
طائر لاہوت کا نغمہ عدم

اک صلیب شاخ پہ آنکھیں سزا!'' (نظم)

فاروق مضطر نے زندگی کے اہم مسائل پر زیادہ پختہ انداز میں نظر ڈالی ہے۔ یہ پختہ انداز ان کے اسلوب میں نرم و مانوس رویوں کا دخل نہیں ہونے دیتا۔ نہ ہی ان کی شاعری کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ انقلابی گھن گرج لیے ہوئے ہے۔ اور یہ گھن گرج ہی ان کے شعری رویے کی تبدیلی کی ضمانت ہے۔ ان کے یہاں گیتوں کا بہاؤ اور گھلاوٹ بھی نہیں جو کسی مخصوص نقطۂ نظر کے حامی کو فوراً اپنی جانب متوجہ کرلے۔ ایک تیسری جہت ہے جو بہت زیادہ کھردری بھی نہیں ہے۔ یہ تیسری جہت جدید شاعری میں بعض نئے امکانات کے پروان چڑھنے کے مواقع کا سراغ لگاتی ہے۔ فاروق مضطر کی بعض نظموں میں جذباتیت نے بھی سر ابھارا ہے لیکن یہ جذباتیت ان فطری عناصر کی مرہون منت ہے جو شاعر کے داخلی ہیجان کی آئینہ دار ہیں۔ یہ داخلی ہیجان انھیں اپنے عہد سے موصول ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں دو مختصر نظمیں ذیل میں درج ہیں۔ ایک کا عنوان ہے ''شر کی آنکھوں میں''

''میں پہاڑوں سے اتر آیا
تو
مجھ پر یہ کھلا
اب پلٹ جانے کی خواہش ہے فضول!
سارے رستے بند ہیں!
شہر کی آنکھوں میں اک پیغام ہے میرے لیے''

(شہر کی آنکھوں میں)

دوسری نظم کا عنوان ہے ''موسم''

''اپنی آنکھیں بند کرلیں
اپنے ذہنوں کے دریچے بند کرلیں
ہونٹ سی لیں
ورنہ!
ہم سب لوگ

زرد پیڑوں سے چپک جائیں گے پتوں کی طرح" (موسم)

فاروق مضطر اپنی شاعری میں رمزیت اور جمالیاتی اقدار کے حوالے سے حسیاتی سطح پر کوئی بات تبھی قبول کرتے ہیں جب انہوں نے اسے جمالیاتی اقدار کی کسوٹی پر اپنے ان تاثرات کو پرکھا ہو۔ اس طرح ان کے دور رس اثرات آج کے ادبی تصورات اور عقائد میں گھل مل گئے ہیں۔ ان کا اطلاق ان موضوعات اور وسائل پر بھی کیا جا سکتا ہے جو آج کی بیش تر تخلیقات کا محرک ہیں۔ اس طرح اعلیٰ فنی اور جمالیاتی معیاری سطح پر دیکھا جائے تو فاروق مضطر کے یہاں کچھ نہ کچھ سرمایہ ایسا ضرور مل جائے گا جن کی مستقل ادبی حیثیت ہے اور جو فکر وفن کے اعتبار سے اپنے اندر اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ بدلتے ہوئے زمانے کی رو میں بھی اپنی صلاحیت کے بل پر اپنی چمک دمک باقی رکھ سکیں۔

"جانے کب سے یونہی جسموں کے خرابوں میں ہیں
آوارہ یہ لوگ!
چہرہ چہرہ۔ گرد گرد!
ہونٹ آنکھیں۔ بے صدا!!
دست و پا۔ درماندگی!!!
جانے کب تک لوگ یوں چلتے رہیں گے
اپنے کاندھوں پر لیے ان دیکھا بوجھ"
(اندھا سفر)

"صدیوں پہلے
ایک دن
اجنبی تاریک غاروں نے ہمیں جنما تھا لیکن
جانے کس خواہش کا جھنڈا گاڑنے
اجنبی تاریک غاروں سے نکل آئے تھے باہر
اور ہم اب تک اسی اک جرم کی پاداش میں
(اپنی آنکھوں کے تعلق سے)

بیکراں روشن خلاؤں میں معلق ہیں

ہمارا جرم۔۔۔۔۔۔!" (ہمارا جرم)

فاروق مضطر ریاست جموں وکشمیر کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے آزاد غزل کا کامیاب تجربہ کیا۔ ہندوستانی سطح پر مظہر امام اور ریاست کی سطح پر فاروق مضطر آزاد غزل کے امکانات کو تلاشنے میں سرگرم رہے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ریاست جموں وکشمیر کے بہت سے شعرا آزاد غزل کی جانب متوجہ ہوئے۔ مظہر امام نے اپنے ایک مضمون جو 'فکر و تحقیق' میں شائع ہوا تھا اور ان کی ایک کتاب میں بھی موجود ہے، اس بات کا تحریری طور پر اعتراف کیا ہے۔ فاروق مضطر نے سماجی سطح پر ایک عظیم کارنامہ جو انجام دیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے "ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی" قائم کی اور آج جموں وکشمیر کے سربرآوردہ تعلیمی اداروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ درجہ اول سے لے کر ایم۔ اے تک کے سائنسی، انجینئرنگ، ماس میڈیا، وکالت، ادب وغیرہ غرض تقریباً تمام شعبۂ ہائے علم کی تعلیم کا یہ مرکز ہے۔

میرے خیال میں اگر فاروق مضطر ادیب و شاعر اور صحافی نہ ہوتے تو شاید اتنا بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے۔ ایک زمانے میں انہوں نے اردو کا موقر جریدہ "دھنک" بھی راجوری سے جاری کیا تھا اور ادبی صفحات پر جموں وکشمیر کے اس دور افتادہ ضلع کا نام اردو ادب کے گہوارے کے طور پر ابھرا۔ یہ رسالہ شب خون کے نظریات سے متاثر تھا اور ایک طرح سے اس کے زیر سایہ جموں وکشمیر میں جدیدیت کے رجحان کو فروغ دینا اس کا نصب العین تھا۔ اس کے اعلیٰ ادبی معیار اور کامیابی کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے جدیدیت کے علمبردار اور اس رجحان کے حامی اعلیٰ معیاری ادب تخلیق کرنے والے اس سے جڑے رہے۔

اس کے دوسرے شمارے میں ہی شمس الرحمن فاروقی، ابن فرید، نصیر پرواز، نصر قریشی، راج نارائن راز، جگن ناتھ آزاد، مظفر حنفی، اختر یوسف، صلاح الدین پرویز، حکیم منظور، یوسف جمال، فاروق مضطر، عابدہ احمد، سلام بن رزاق، عابد پیشاوری، احمد شناس، عبدالمتین، ایمن جعفری، اشہر ہاشمی، رینا حیدری، اثر بدایونی، سید شمیم گوہر، سلیم شیرازی، ملکہ جواد، نیاز الدین نیازی، پرتپال سنگھ بیتاب اور سید مرتضیٰ خوشتر کی تخلیقات نظم و نثر شامل تھیں۔ ان حضرات کے علامہ

دھنک کے پاس عشرت کاشمیری، قمر احسن، ظہور الدین، احمد تنویر، مالک رامانند، بشیر بدر، بانی، رئیس فراز، مظفر عازم، ظہیر غازیپوری، عابد مناوری، یوسف جمال، عبید الرحمن ہاشمی، نظام صدیقی، عتیق اللہ، ارتکاز افضل، حمید سہروردی، مدحت الاختر، شکیل مظہری، منظر اعظمی، تمنا تماپوری، زاہدہ زیدی، حامدی کاشمیری، وزیر آغا، نثار صدیقی، م ق خان، سعادت احمد، صبا اکرام، ماجد الباقری، سلیم شہزاد، عبد المجید، شہنشاہ مرزا، محمد یٰسین، پرکاش فکری، احتشام اختر، شاد نوحی، عین تابش، راشد فضلی، آنند لہر، شباب للت، غزالہ مریم، ظہور شید اظہیر، رام لعل، علی امام نقوی، فاروق شفق، عشرت ظفر، اقبال منہاس، اعجاز عبید، وقار ناصری، رفیق راز، حسن عزیز، محمد احمد رمز، رخسانہ جبین، شاہد عزیز، شاہد کلیم، منظور ہاشمی، مظفر نقشبندی، سطوت رسول، ظفر صہبائی، عبد الرحیم نشتر، مشتاق فریدی، شہباز راجوروی، صحر سعیدی، تسلیم انجم، سطوت شمسی، اسلام پرویز جیسے دوسرے بہت سے تخلیق کاروں کا ایک وسیع حلقہ تھا جو دھنک میں شائع ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ ریاست جموں وکشمیر سے جو نام آج کے ادبی افق پر اپنی ایک الگ شناخت اور اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں اور بعضوں کو جو اعتبار حاصل ہے ان کے فن کو اجاگر کرنے میں دھنک کا کردار بہت اہم رہا ہے۔

دھنک کا پہلا شمارہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔ تقریباً چار پانچ سال میں دھنک کی اشاعت آئندہ وقتوں کے لیے ملتوی ہوگئی لیکن شاید اسی سے حاصل تجربات نے انہیں راجوری اور قرب وجوار میں حصول تعلیم کی وقتوں کی جانب توجہ دلائی ہوگی۔ اور وہ عزم راسخ بھی ادب کا ہی مرہون منت ہوگا کہ ہم آج ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی کو اس عروجی سطح پر دیکھ رہے ہیں۔

نمونہ تحریر

ادب، اظہار اور ذات

اداریہ۔از۔فاروق مضطر،مطبوعہ،دھنک شمارہ (۹)، ۱۹۷۷ء

فن کار اپنی بات کہے یا دوسروں کی ، یہ سب وہ اپنی ذات کے حوالے سے کہتا ہے۔فنکار کی غیر معمولی حساسیت معاشرے اور افراد کے کرب کا بہترین سطح پر احاطہ کر لیتی ہے،لیکن معاشرے سے فرد (یعنی فنکار کے وژن) تک پہنچنے کے لئے مسائل کو کئی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔فن کا موضوع بننے سے پہلے خارج میں کسی معمولی یا غیر معمولی واقعے کی بنا پر فن کار کے تخیلی عوامل (شعوری یا لاشعوری عوامل) متحرک ہوتے ہیں۔اس تحریک کی تشدید اور شعور کے تصادم سے منتج صورت حال یا کیفیت فنکار کو خواب و بیداری کی سرحد پر لا کھڑا کرتی ہے۔اس مقام پر فنکار کی آنکھ اپنی ہوتی ہے۔مگر انتخابی صلاحیتوں سے محروم! آنکھ کے سامنے جو تماشا یا مناظر متحرک رہتے ہیں، وہ سب شعوری، لاشعوری سرمائے سے ماخوذ ہوتے ہیں۔اخذ وقبول کا یہ عمل خارجی واقعے یا منظر کی مناسبت سے زریں سطح پر ایک خود کار انتخابی عمل لئے ہوتا ہے۔یہ انتخابی شعور ہی آگے چل کر فن کار پر یک بیک موضوع کا انکشاف کرتا ہے۔یہ عمل کسی زمین دوز چشمہ کے پھٹ پڑنے کے عمل سے مشابہ کہا جاسکتا ہے۔

تخلیقی عمل کے دوران فن کار جب لذت وکرب کی انتہائیوں سے گزرتا ہے،تو وہ موضوع (چاہے زمینی ہو یا ماورائی) سے اس قدر وابستگی کا احساس کرتا ہے کہ وہ اسے اپنی ذات سے باہر کسی دوسری ذات یا خارج میں موجود کسی شئے سے منسوب ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ۔یوں جب نغمہ (تخلیق) ذہن وروح کی اتھاہ گہرائیوں سے بالائی سطح پر ابھر آتا ہے تو فن کار کو اپنے عزیز ترین سرمائے میں کسی غیر معمولی اضافے کا احساس ہوتا ہے۔

اس سارے عمل کے دوران فن کار متکلم اور مخاطب کی دو متضاد شخصیتوں میں بٹے رہنے کے جبر سے گزرتا ہے، دوسرے الفاظ میں فن کار اپنے اندر کسی نا معلوم شخصیت سے مخاطب رہتا ہے۔اس شخصیت کے مزاج، روئے اور جذبات وحسیات کا فن کار کے جذب وحسیت سے ہم

آہنگ ہونا ضروری ہے (بلکہ ایسا ہی ہوتا ہے) اس ہم آہنگی سے وہ داخلی ربط جنم لیتا ہے، جسے ہم داخلی خود کلامی سے موسوم کرتے ہیں۔۔۔۔واضح رہے کہ یہ داخلی خود ربط (تخلیقی) لمحے کی حدود و وسعت کے ساتھ ہی زندہ رہ پاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ تخلیقی لمحہ ''زبان کی رسمی حدود سے ماوراا اور ماضی، حال اور مستقبل، سب پر محیط ہوتا ہے۔

جدید شاعری میں سورج "ایک علامت"

از۔ فاروق مضطر، مطبوعہ، دھنک، شمارہ، (۹) ۱۹۷۷ء

تخلیقی عمل سے واقف شخص پیکر، استعارہ اور علامت کی قدر و قیمت اور صنف شعر سے اس کے رشتے کی اہمیت سے منحرف نہیں ہوسکتا۔ ان دنوں شاعری میں ابہام اور ژولیدہ بیانی کا جو رونا رویا جارہا ہے، اس کا سبب تخلیقی عمل کی پیچیدگی سے عدم واقفیت ہی ہے۔ غالب کے کلام کو اس کے ہم عصروں نے اور اقبال کو ترقی پسندوں نے مہمل اور لغو ٹھہرایا تھا۔ شائد ایسے ہی موقعہ پر غالب نے شان بے نیازی سے کہا تھا۔

ع گرنہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

زبان کی ارتقائی تاریخ پر نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ انسان ہمیشہ سے اشاروں اور کنایوں کے ذریعے ہی بات کو معنی خیز اور پر تاثیر بناتا رہا ہے۔ شعری علامت اس کی ارتقائی شکل ہے۔ جدید شاعری میں علامتی یا استعاراتی اظہار دراصل ان توانا شعری اسالیب کا اعادہ وتوسیع ہے، جو میر، غالب اور اقبال کے توسط سے یہاں تک پہنچی ہیں، لیکن۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

غالب کے نمک کی ڈلی اور دال سے متعلق اشعار کو ایمائی اسلوب کا حامل نہیں کہا جاسکتا ۔ یہاں اقبال کی ایک غزل کے دوشعر ملاحظہ ہوں تا کہ آپ نثری خطابت اور ایمائی اسلوب والے اقبال میں فرق کرسکیں۔

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ مرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف، تو تو مجھے گوہر شاہوار کر
عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

پہلے شعر اور بعد کے ان اشعار کا فرق بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ بعد کے اشعار کا شعری

رو یہ ہی اقبال کو ہمارے عہد کا سب سے اہم اور بلند قامت شاعر بناتا ہے۔ پہلے شعر میں رسمی فکر کا غلبہ ہے، جب کہ بعد کے اشعار جذبے کے ماتحت ہیں۔ پہلے شعر میں مریض کے ساتھ طبیب کی سی ہمدردی کا اظہار ہے اور نسخۂ خودی کی تجویز ہے۔، جبکہ بعد والے شعروں میں ذاتی بے چارگی اور دردمندی کے عناصر ہیں۔ پہلے شعر میں پیغمبرانہ خطابت اور بلند آہنگی ہے، جبکہ بعد والے اشعار میں ایک خواب ناک حزنیہ داخلی لہجہ، اسی لہجے میں اقبال کا ایک اور شعر دیکھئے۔

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے درد ناک
جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں

غالب نے ایک شعر میں لفظ کے علامتی حسن و جمال کا اعتراف یوں کیا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کے غالب ،مرے اشعار میں آوے

اسی پر بس نہیں ،شبلی نے ''شعر العجم'' میں تشبیہ اور استعارے کے عمل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اکثر موقعوں پر تشبیہ یا استعارہ سے کلام میں جو وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے، وہ کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ مثلاً اگر اس مضمون کو کہ فلاں موقعہ پر نہایت کثرت سے آدمی تھے، یوں ادا کیا جائے کہ وہاں آدمیوں کا جنگل تھا،تو کلام کا زور اور بڑھ جائے گا۔ یہاں کلام کا اصلی مقصد آدمیوں کی کثرت بیان کرنا ہے۔ جنگل کی تشبیہ کی وجہ سے کثرت کا خیال متعدد وجہوں سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ جنگل کی زمین میں قوت نامیہ بہت ہوتی ہے، اس لئے اس میں گھاس، پودے اور درخت کثرت سے پاس پاس اگے ہیں۔ اس کے ساتھ نمو کا سلسلہ برابر قائم رہتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز جہاں کثرت سے پیدا ہوتی ہے، بے قدر ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر جنگل میں گھاس اور درخت کی کچھ قدر نہیں۔ مثال مذکورہ میں تشبیہ نے یہ

تمام باتیں پیش نظر کر دیں۔یعنی آدمی اس کثرت سے تھے
،جس طرح جنگل میں گھاس ہوتی ہے،آدمیوں کا سلسلہ منقطع
نہیں ہوتا، بلکہ بھیڑ بڑھتی جاتی تھی۔ایک جاتا تھا تو دس آجاتے
تھے۔کثرت کی وجہ سے آدمیوں کی کچھ قدر نہ تھی۔یہ تمام باتیں
ایک لفظ نے ادا کر دیں۔اس لئے خود بہ خود کلام میں زور آ
گیا۔''

اگر چہ اس اقتباس میں موصوف نے تشبیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔تاہم اس سے شعر میں استعمال ہونے والے لفظ کی کثیر الجہتی اور اظہار کی لفظی کفایت شعاری پر جو بحث ہوئی ہے، وہ اشعار سے اور علامت کے عمل سے مشابہ ہے۔جدید شعرا نے جہاں مواد و ہیت میں انقلابی تبدیلیاں لائیں، وہیں گل و بلبل، ساقی و محتسب، باغباں و گلچیں، قفس و آشیانہ، اور برق و صیاد جیسے بے جان استعاروں اور محاوروں کی بے روح اور جامد شعری زبان (جو میر، غالب، اقبال بلکہ ترقی پسندوں تک کے لئے پیر تسمہ پا بنی رہی) سے نجات حاصل کر کے جدید معاشرتی نظام میں فرد کی باطنی نا آسودگی، انتشار، خوف و تردد، تحیر و تجسس، بے گانگی، بے یقینی اور روحانی بے بصیرت کی کیفیات سے ہم آہنگ جدید تلازمے، استعارے اور علامتیں خلق کیں۔اس سے زبان میں بے پناہ توسیع پیدا ہوئی اور شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ کا معنوی کینوس نثری استعمالات کے بالمقابل پھیلاؤ اور ہمہ جہتی کا حامل ہو گیا۔یہی سبب ہے کہ جدید علامتیں اور استعارے سمندر، دشت، ہوا، پانی، مکان، صحرا، دیوار، پرندہ، درخت، حلاٰ، سانپ اور ایسے ہی دوسرے تلازمے اپنی بسیار جہتی اور پر اسراریت کے باعث سنجیدہ قارئین کے لئے زیادہ کشش اور معنویت لئے ہوئے ہیں۔لیکن مشاعرہ گاہوں کے تربیت یافتہ سہل پسند قارئین کے لئے ایسے اشعار مبہم، منتشر اور مہمل ہیں۔

یہاں ہم جدید شعری اظہار کے چند ایسے نمونوں کا مطالعہ کریں گے، جن میں لفظ ''سورج'' کا بار بار استعمال ہوا ہے۔تاکہ ایسے الفاظ کی تہہ در تہہ کیفیات، کثیر الجہتی اور انسلاکاتی معنویت کا سراغ لگا سکیں اور لامحدود معنوی تناظر کو قلیل حروف و الفاظ کی گرفت میں لانے کے اس تخلیقی عمل سے واقف ہو سکیں، جسے شبلی نے تشبیہ یا استعارہ کا نام دیا ہے، اور نئی تنقید اسے علامت

کہتی ہے۔یونگ نے لفظ ''سورج'' کو آگ سے رشتے کی مناسبت کے سہارے خلاقانہ قوت روحانی، عرفان وقت اور زندگی کے گذران کی علامت کے معنی ومفہوم کا حامل کہا ہے۔اسی معنوی تناظر میں کمار پاشی کا یہ شعر دیکھئے۔

مل گئے سارے عقائد خاک میں

پانیوں میں بہ گیا سورج مرا

یہاں پہلے مصرعے میں عقائد کے خاک میں ملنے پر پچھتاوے کی کیفیت نے دوسرے مصرعے میں لفظ ''سورج'' کو لغوی مفہوم سے اٹھا کر دیومالائی علامت کا درجہ دے دیا ہے۔یعنی سورج دیوتا کی عظمت وجلالیت کا تصور۔یہی اعتقاد کل تک شاعر کے ذہن وروح کو مطمئن اور منور کرتا تھا،لیکن جدید سائنس کے تحیر زاانکشاف نے شاعر کی عقیدت مندی کو مضروب ہی نہیں کیا بلکہ مضحکہ خیز بنادیا ہے۔موصوف کا ایک اور شعر اسی معنوی کیفیت کا حامل ہے۔

ٹوٹ کر بجھ گئے آکاش پہ سارے سورج

اور میں رہ گیا اس دہر میں ،اندھا ہو کر!

اس شعر میں بھی عقائد واقدار کے انتشار و پامالی کے سبب سے جدید انسان کی روحانی بے بصیرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ندا فاضلی کا ایک بدنام زمانہ شعر دیکھئے۔

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا

کھڑکی کے پردے کھینچ دئے،رات ہو گئی

منجھی ہوئی زبان میں شعر کہنے اور سننے والے اکثر حضرات اس شعر میں سورج کی چونچ میں پکڑے جانے کو بچکانہ حرکت سمجھ کر محض کھلکھلا پڑتے ہیں، یا لاحول پڑھنے لگتے ہیں ،حالانکہ مرغے اور سورج کی نسبت سے ذہن آسانی سے صبح کے منظر کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔مرغ سورج کو چونچ میں لئے کھڑا رہا،یعنی صبح ہونے کا بار بار اعلان کرتا (بانگ دے کر) تاکہ شاعر بیدار ہو،لیکن شاعر اس کے برخلاف کھڑکی کے پردے کھینچ کر سویا رہتا ہے۔یعنی جان بوجھ کر اس فریب میں مبتلا رہنا چاہتا ہے، گویا ابھی رات ہی ہے۔وجہ ظاہر ہے،رات آرام ،سکون وسکوت کا استعارہ ہے اور دن ،مصروفیت ،جدو جہد اور تھکن کا۔اسی لئے شاعر دن کے استقبال کے بجائے خود پر رات کے تواتر کا احساس طاری رکھنا چاہتا ہے۔ندا کا ہی ایک اور شعر

ہے۔

بسوں کی بنچ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلتے نین کی کھولی میں چاند سوتا ہے

اس شعر میں زندگی کی روایتی تزئین و تربیت کی بجائے صنعتی تمدن کے زیر اثر برہمی، دوڑ بھاگ اور بے مکانیت کی صورت حال کو اجاگر کرنے کے لئے ''سورج'' کو بسوں کی بنچ سے طلوع ہونے کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی اب لوگوں کی صبح بسوں کی بنچ پر سفر کرتے ہوتی ہے۔ مدحت الاختر کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

تاروں کی چھاؤں میں تو بہت دیر سو چکے
سورج کی روشنی میں ذرا جاگ جایئے

تاروں کی چھاؤں بے حسی، آرام وسکون کی زندگی یعنی ماضی اور ''سورج'' کی روشنی آگ، تپش کی نسبت سے زمانۂ حال کا ہوش ربا منظر، انتشار و بے سکونی، تخریب، دردمندی کا احساس۔ ناصر کاظمی کا ایک شعر ایسا ہی ہے۔

یہ کیسی شب ہے کہ دن سے زیادہ روشن ہے
چمک رہے ہیں فلک پر ہزارہا سورج

یہاں ''شب'' شاعر کی تنہائی اور خلوت کا ایک ذاتی لمحہ فلک پر ہزارہا سورجوں کی چمک، ذہن و دل میں وابستہ رشتوں اور تعلقات کی یادیں اور ان یادوں کی نسبت سے دکھ درد کی کیفیات ذہن میں یادوں اور خیالوں کے کوندوں کی چمک۔ اب دو نظموں کے اقتباس ملاحظہ ہوں۔

''رات اماوس کی تھی، میں نے
ناگ پھنی کے ایک کانٹے پر
ایک پل کے سویں حصے تک
سورج کو روشن دیکھا تھا
پھیل گیا میری آنکھوں میں، سوراتوں کا گھور اندھیرا
اور مجھے محسوس ہوا یوں، گھور اندھیرے کے سینے میں

میں بجلی کا اک کوندا ہوں''

یہ نظم راج نارائن راز کی ہے۔اس میں جذبے کی ایک ماورائی کیفیت کا تمثیلی بیان ہے، یہاں ''سورج'' عرفان ذات اور خود آگہی کا استعارہ ہے۔محمد علوی کی ایک نظم کا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

''شکستہ مکانوں کے نیچے اندھیرا کھڑا تھا
نئے سال کا زرد سورج
محلے کے گھورے پہ اوندھا پڑا تھا''

یہاں زرد سورج ان پہلے اور دق زدہ چہروں کی بے یقینی ،الم ناکی اور مفلوک الحالی کی علامت ہے، جو اندھیری شکستہ چھتوں کے نیچے ہزاروں سال جی لیتے ہیں اور ان شکستہ چھتوں کے نیچے ان کے لئے کوئی موسم نیا اور خوش گوار نہیں ہوتا۔ان کا حال ماضی اور مستقبل، یہی اندھیرا اور شکستہ چھتیں ہوتی ہیں۔

اس مختصر اور سرسری مطالعے سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ جدید نسل نے معنی ومفاہیم کی وسیع تر، مگر پوشیدہ کائنات کا سراغ لگانے کے لئے لفظ کو کس طرح وسیلہ بنایا ہے،اور لغت کے دشت امکاں کو کس خوبی سے کھنگالا ہے۔اس کے بعد اس الزام کی کوئی حقیقت نہیں رہتی کہ نئی نسل زبان وفن کی روایات سے بے بہرہ ہے یا قاعدہ، قانون سے عدم واقفیت کی بنا پر محض وقار واعتبار بنائے رکھنے کے لئے زبان کی توڑ پھوڑ اور تشکیل نو کا بہانہ لئے ہوئے ہے، بلکہ جدید نسل نے لفظ کے کثیر الجہت استعمال سے اور اظہار کے غیر روایتی وسائل اپنا کر زبان وفن کو نئی زندگی بخشی ہے۔

تبصرہ و تذکرہ

نا یافت: مصنف۔حامدی کاشمیری

مبصر: فاروق مضطر (مطبوعہ، دھنک، شمارہ (۸)

زمین سے آسمان تک، ایک افق سے دوسرے افق تک پھیلے ہوئے کائناتی منظر میں انسان کی تخیلاتی وسعتوں کی گہرائیوں میں دھرے ہوئے ارضی دھنکی موجودات، آگاہی کے ساتھ ساتھ خود انسان کی بے بضاعتی، بے بسی و مجبوری کا احساس دانشور طبقہ کے لئے نہایت تکلیف کا باعث تو تھا ہی، اس پر ستم یہ کہ نئی عقلیت کے فروغ اور تہذیبی تصادمات کے ہمہ گیر اثرات نے اقداری و اخلاقی نظام کی شکست و ریخت کر کے انسان کو بے عقیدگی، غیر محفوظیت، عدم اطمینانی، تقدیر کی جبریت، غیر فطری موت اور تباہی کے بے پناہ خوف و احساس کا شکار کر دیا ہے۔اس طرح معاشرے کا دانشور طبقہ اور حساس ترین افراد اپنے وجود کے عدم جواز کے مسائل اور اس کے تحفظ کی فکر میں مبتلا ہو گئے ہیں۔اس دہشت نے اس کا ایمان ہر چیز سے اٹھا دیا ہے اور اسے دائمی تشکیک کے مرض میں مبتلا کر دیا ہے، اس سے اجتماعی اقدار کے مقابلے میں انفرادی رد عمل اور رویے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔اسی صورت حال نے دانشور طبقے کو افراد کے حواس و شعور کو بیدار کرنے کے عمل پر آمادہ کیا۔اب ہر فن کار کے یہاں خارجی محرکات کے دباؤ میں انتہائی ذاتی اور داخلی عمل، مظاہر و ایثار کی طرف رویے کا تعین کرتا ہے۔ہم عصر زندگی کے اسی خارجی و داخلی سیاق و سباق میں ''نایافت'' کی شاہی لفظی و معنوی اعتبار سے آج کی اہم ترین اور حقیقی شاعری کہی جانے کی مستحق ہے۔تجسس، تحیر اور خوف زدگی کی کیفیات کو معنوی پیکر دے کر حامدی نے جدید تر حسیت سے اپنی مکمل باخبری اور فن سے مخلصانہ خدوخال کو بہت نمایاں کیا ہے۔''نایافت'' کا لب و لہجہ، ڈکشن، مواد و موضوع، یہ سب اس پر دال ہیں۔''نایافت'' میں حامدی نے ''عروس تمنا'' کے رومانوی خول کو توڑنے کے لئے اپنے داخلی رد عمل کے اظہار ہی کو جن علائم و استعارات کو وسیلہ بنایا ہے، وہ سب ان کے گھر، آنگن، گلی، شہروں اور دشت سے ماخوذ ہیں، یعنی حامدی کاشمیری کی شعری زبان مقامی فضا، ماحول، منظر اور موسمی کوائف کے بطن سے پھوٹی ہے۔ایک امتیازی صفت نے

ان کے اظہار میں فطرتیت اور فکر و احساس میں اجنبیت کی بجائے اپنائیت کا احساس پیدا کیا ہے، اور ان کے انفرادیت کے نقوش کو اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ ذیل میں چند اشعار نقل ہیں، جو مقامی بوباس اور فنی اعتبار کی روشن دلیل ہیں۔

وہ بھی بے آواز اڑتے طائروں کی ڈار تھی
یک بیک کیوں برف کے بہتے سمندر تھم گئے

سایۂ اشجار سے نکلی تھی جرس ماہتاب
اک ذرا سا چھو لیا ،کالا سمندر ہو گئی

ننگی شاخوں پر پرندے ،رات بھر روتے رہے
عیش گاہوں میں وہ سب کے سب ،پڑے سوتے رہے

مل ہی جائے گا وہ چشمہ،ان پہاڑوں میں کہیں
آگیہ کا درد ہے،دیکھو، فضوں ہو جائے گا

اب نہ گونجے گی کبھی گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا
بجھ گئے برگ شفق،سائے حزیں ہوتے گئے

خود اپنی ذات تھی پرچھائیوں کا اندھا سفر
ہم اعتماد کسی میں بحال کیا کرتے

آوارہ سب کو کر گئے پھولوں کے قہقہے
دیوانہ موسموں میں بھی ہم گھر میں رہ گئے

سحر سے پہلے ہی کھائی میں چھینک آیا تھا
کواڑ کھولے رہی دشت،سنگ سامنے تھا

برف کے وہ استخوانی ہاتھ،وہ پاگل ہوا
صبح تک کتنے ہی زندہ شخص دفنائے گئے

الغرض حامدی ان اطراف کی معتبر اور توانا آواز ہیں۔

نمونہ کلام

نام: مرزا محمد فاروق

قلمی نام: ڈاکٹر مرزا فاروق انوار

پیدائش: ۱۹، اکتوبر ۱۹۶۴ء

تعلیم: پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

تصنیف: چانن (پہاڑی شعری مجموعہ)

اعزاز: جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈمی ایوارڈ

پیشہ: سرکاری ملازمت ایڈیٹر کم کلچرل آفیسر (پہاڑی)

پتہ: Jammu And Kashmir Art Cultural Academy,canal road Jammu

غزل

سب کی زباں پہ تھا ترا چرچا تمام رات
چھت پر تمہاری چاند بھی ٹھہرا تمام رات

ہم نے سنا ہے بلبلوں کو بھی ہے رت جگا
پھولوں نے گایا ہے ترا سہرا تمام رات

جس کے لئے تھی آہ مری، فرش راہ سی
آیا وہ جب تو غیر کے ٹھہرا تمام رات

میں ہی نہ اک وجود کی صورت سمٹ سکا
دیکھا اسے تو ریت سا بکھرا تمام رات

نکلا تھا بحر بے کراں کی سیر کے لئے
لیکن میں بوند بوند کو ترسا تمام رات

انوار ظلمت شب ہجراں میں تو ہی بس
اک آسرا تھا، آس تھا، تنہا تمام رات

فاروق انوار مرزا

مرزا فاروق انوار کی شاعری میں واردات حسن وعشق، ان سے جڑے خیالات اور مکالماتی منظرنامے اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ فاروق انوار نے غزل کی اس مستحکم روایت کے باہر دیکھنے کی جستجو ہی نہیں کی بلکہ اسی ناز وانداز سے اسے سنوارنے اورنکھارنے کی کاوش میں لگے رہے جوحسن وعشق کے حقیقی سے زیادہ مجازی روش کواختیار کرنے والوں کی خصوصیت ہے۔شمیم حنفی نے کیا خوب لکھا ہے۔

''شاعری کی زبان میں نہ تو ان اصولوں کا اطلاق مناسب ہے جوفلسفہ اورعلوم کی زبان سے مخصوص ہیں، نہ وہ دلائل کارآمد ہوسکتے ہیں جن کا استعمال نثر کرتی ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ شعر یا نثر کا خام مواد ایک ہو۔ یا وہ عناصر ایک ہوں جو شعری یا نثری اظہار کے لیے فکری بنیادیں مہیا کریں، لیکن شاعر کا اعصابی نظام، اس کے احساس کی حرارت اور جذبے کی تندی، الفاظ کے رسمی رشتوں کو درہم برہم کرتی رہتی ہے۔''

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از شمیم حنفی، ص٦٩)

مرزا فاروق انوار کی شاعری بھی غزل کی مندرجہ بالا صفات سے متصف ہے۔

نمونہ کلام

نام: لیاقت علی جعفری
قلمی نام: لیاقت جعفری
پیدائش: ۱۸،فروری ۱۹۷۱ء،وارڈ نمبر ۲،پونچھ
تعلیم: ایم۔اے(اردو)پی۔ایچ ڈی۔
پیشہ: اسسٹنٹ پروفیسر اردو
موجودہ پتہ: Maulana Azad Degree College In Front Of Jammu University Gate ,Jammu
موبائل: 9419184052

غزل

میں خود تک لوٹ آؤں ،راستہ کوئی نہیں دے گا
مجھے اس شہر میں ،میرا پتہ کوئی،صابر مرنہیں دے گا

مری ویرانیوں! کس نے تمہیں آباد رکھنا ہے
مری خاموشیوں! تم کو صدا کوئی نہیں دے گا

سبھی تقسیم کر لیں گے خداؤں کے قبیلے کو
مگر مجھ کو کبھی میرا خدا کوئی نہیں دے گا

ہماری کشتیاں لہروں کی زد پہ چھوڑ دیں گے سب
ہمارے بادبانوں کو ہوا کوئی نہیں دے گا

میں اس امید پر اٹھا تھا اس بستر کے پہلو سے
کہ اب بیمار کو اتنی دعا کوئی نہیں دے گا

مسیحائی کے سب اعزاز میرے نام کر دیں گے
مرے ہاتھوں کو لیکن معجزہ کوئی نہیں دے گا

میں گرتا ہوں ،اگرچہ تھامنے والا نہیں کوئی
میں چلتا ہوں اگر چہ راستہ کوئی نہیں دے گا

اسے بھی بخش دے گا اس کے ہونے کے تقدس میں
مجھے بھی میرے ہونے کی سزا کوئی نہیں دے گا

یہ بچپن استعارہ ہے تری بے احتیاطی کا
تمہارے ہاتھ میں اب آئینہ کوئی نہیں دے گا

بقول حضرت غالب ،یہ نمرودی خدائی ہے
مجھے بدلہ مری نیت کا کیا کوئی نہیں دے گا؟

ڈاکٹر لیاقت جعفری

لیاقت جعفری تہذیب و اقدار کی مثبت روایتوں کے پرستار ہیں۔ انھوں نے عقل و عشق کی ہم آہنگی سے پیدا شدہ تہذیبی، اقتصادی اور معاشرتی ماحول کی آئینہ داری کو اپنے اشعار کے موضوعات کی شکل دی ہے، وہ معاشرے پر عقل کے بیجا تسلط کو مشتبہ سمجھتے ہیں، جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ انھیں سماج میں فرد کی حیثیت اور اس کے وزن و وقار کا پورا علم ہے اور عشق بمعنی انسانی اقدار پر عقل بمعنی سماجی منفی پہلوؤں کی صورت میں ذاتی اقدار کا تسلط ایسی راہوں کو کھولتا ہے جہاں فرد کی ہمدردی اور معصومیت کا نشان مٹ جاتا ہے یا بالکل ماند پڑ جاتا ہے۔ ان کے اشعار سے ظاہر ہے کہ اپنے احساسات کی ترجمانی کے لئے بہترین استعاروں اور علامتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہاں سوسن لینگر کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں۔

'علامت متعین کرنے کا عمل استدلال سے پہلے ہوتا ہے، تعقل
سے پہلے نہیں۔ یہ انسانی تعقل کا نقطۂ آغاز ہے اور تفکر، تخیل اور
تعمل سے زیادہ ہمہ گیر اور عمومی ہے'' (فلسفے کا نیا آہنگ)

سوسن لینگر کے ان الفاظ کو یہاں درج کرنے اور اس کے نقطۂ نظر سے لیاقت جعفری کے اشعار کو دیکھنے کا مقصد یہ ہے کہ انھوں نے تعقل کو حرف غلط تصور نہیں کیا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ وہ تعقل پرستی کے بے محابا اور بیجا رجحان کو تسلیم نہیں کرتے ورنہ تعقل کے مثبت مقام و مرتبے کا کون قائل اور حامی نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ابھی اک آگ ہے پانی کے اندر
کوئی سجدہ ہے پیشانی کے اندر

کوئی آسیب تھا پانی کے اندر
کشش تھی ایک طغیانی کے اندر

بہت آسانیاں ہیں مشکلوں میں
بہت مشکل ہے آسانی کے اندر

مگر اس روز الجھن معجزہ تھی
سکوں سا تھا پریشانی کے اندر

کس جگہ لوٹ کے پہنچا ہوں، یہ گھر کس کا ہے
پاؤں میرے ہیں، مگر ان میں سفر کس کا ہے

لیاقت جعفری کے یہاں روایتی قدروں کی جو پاسداری ملتی ہے، وہ نئی شاعری کی فطرت سے وابستہ ہے نہ کہ مراجعت کی کوئی شکل۔ اس طرح ان کے اشعار ماضی کے آئینے میں تاریخ و تہذیب کے سہارے آگے کا سفر طے کرتے ہیں اور شعری شعور و آگہی کے دھارے مستقبل کے امکانات کی جانب بڑھنے کا اشاریہ بن جاتے ہیں۔ ان کے اس قسم کے اشعار سے جو اہم نقطہ برآمد ہوتا ہے، وہ یہ کہ روایت کی قدر کئے بغیر انسان یا نسل کی قوتیں پژمردہ اور ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ حوصلوں کو جلا نہیں ملتی اور انسان یا نسل کی اپنی شخصیت کا صحیح انکشاف نہیں ہو پاتا۔ اس طرح لیاقت جعفری کے اشعار فطرت سے وابستگی اور تہذیب کی اعلیٰ قدروں کی آرزومندی کا استعاراتی اظہار بن جاتے ہیں۔

دائرے کے ادھر ادھر تھوڑا
کچھ نہ کچھ درمیان کے بھی پرے

شہر تھا اک بسا بسایا ہوا
میرے اجڑے مکان کے بھی پرے

عین ممکن ہے، ہو زمیں جیسا
کچھ نہ کچھ آسمان سے بھی پرے

یہ اور بات کہ تم کو نظر نہیں آتا
جو ہو رہا تھا ابھی بار، بار کچھ تو تھا

ہمارے دل میں، ہمارے دماغ میں ہر پل
چھپا چھپا ہی سہی، آشکار کچھ تو تھا

لیاقت جعفری کے اشعار میں فکر کی ایک لہر خاموش احتجاج کی صورت میں بھی ابھرتی ہے۔ یہ احتجاج اس بے حسی کے خلاف معلوم ہوتا ہے جس نے فطرت کی قدروں کے حسن کے احساس کو تقریباً زائل کر دیتا ہے۔ عقل کی نئی ترقی یافتہ شکل نے تقریباً ہر وجود کے گرد مصلحتوں کے دائرے کھینچ دئے ہیں اور جذبات کی ریشمی ڈور خستہ ہوگئی ہے۔ شعروادب، فن اور جمالیات کا کوئی بھی شعبہ شائد ہی اس سے بچا ہوا ہو۔ شہری اور دیہی زندگی کی معاشرتی فضا میں عجیب قسم کا انقلاب آ گیا ہے، جسے کہ فکری ذہن مثبت یا منفی کے خانے میں ڈالنے سے قاصر ہے۔ فکر کے زاویوں کے کہیں کم وبیش اور کہیں یکسر بدل جانے سے مثبت اور منفی دونوں قسم کی جہتوں میں غیر متوقع اضافے ہوئے ہیں۔ غور کیا جائے تو دونوں جگہوں پر افراد کے باہمی رشتوں یا فرد اور اس کے ماحول کے ربط کی نوعیت اب پہلے جیسی نہ رہی۔ یہاں سال بیلو (Saul Bellow) کے ایک کردار کے الفاظ یاد آتے ہیں۔

''آدمی ہونے کا کیا مطلب ہے ایک شہر میں، جو تبدیلیوں سے دو چار ہو۔ ایک ہجوم میں، جس کی ہیت سائنس نے بدل دی ہو، ایک منظم طاقت کے ذریعہ زبردست پابندیوں کی گرفت میں، میکانکیت کے باعث پیدا شدہ صورت حال میں، انقلابی امیدوں کی حالیہ ناکامی کے بعد۔ ایک معاشرے میں جو فرقہ نہیں اور جس نے انسان کی قیمت گھٹا دی، اعداد کی ضرب دی ہوئی طاقتوں کی وجہ سے، جس نے ذات کو ناقابل توجہ بنا دیا''
Saul Bellow: Herzog, Quoted from -

Art And Belief,By David W. Bolam &
James
(بحوالہ L.Handerson,London.1967,p.24
جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از۔ شمیم حنفی، ص، ۸۴، ۸۳)

قرب اور رفاقت کے اس بدلے تصور نے احساس روح پر جو نقش قائم کیا ہے، اس کی بعض تصاویر جعفری کے اشعار میں ملتی ہیں۔

میں اس لئے بھی آج بہت بے قرار تھا
وہ آ چکا تھا اور مجھے انتظار تھا

شبنم حدود تھی ،کہیں دریا معیار تھا
اور میرے ذہن و دل پہ سمندر سوار تھا

غبار اٹھتے ہی سارے درخت چیخ پڑے
کہ ہو رہا تھا ہوا کا سفر، ہوا کے خلاف

تمام شہر کی نظریں تھیں آسمان کی اور
کہ اڑ رہے تھے پرندے ،مگر ہوا کے خلاف

ترازو تو سبھی سچ بولتے ہیں
مگر سامان کو کم تولتے ہیں

لیاقت جعفری ایک ایسے سماج اور معاشرے کے خواہاں ہیں جہاں انسان کا رشتہ اس کی مٹی سے قائم رہے لیکن مثبت قدروں کے دائرے میں۔ان دائروں سے نکلنے پر مٹی کی سازشوں میں گرفتار ہو جانا تقریباً لازمی ہے۔اسی طرح جسم اور روح کے متضاد جذبات سے عقل کی دوری کلی وجود کی حفاظت کے سلسلے میں غیر مناسب فضا ہموار کرتی ہے۔ یہ ہمواری جہاں انسان

کے اپنے سہی سمت کے سفر کی راہ میں حائل ہے، وہیں حساس ذہنوں بالخصوص حساس شعری ذہنوں میں اندھیروں کا احساس اور گہرا کر دیتی ہے۔ یہ صورت حال نئی حسیت کو کشمکش کی ان انوکھی پیچیدگیوں سے دو چار کرتی ہے، جو اس سے قبل اپنی نذیر نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے کہ مشینی آلات نے بہت سی ان چھپی ہوئی حقیقتوں کو بھی آشکار کر دیا ہے، جن سے جذبات و احساسات اب تک لاتعلق تھے۔ لیاقت جعفری نے اشاراتی اور علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے ان کی بہترین آئینہ داری کی ہے۔

کئی دن سے عجب الجھن ہے مجھ کو
مرا بچہ مری دستار مانگے

کھلونے بیچنے بیٹھا ہے بوڑھا
کوئی نیزہ، کوئی تلوار مانگے

اکیلا پن مرا اکتا چکا ہے
یہ لشکر، قافلہ سالار مانگے

لیاقت جعفری کے اشعار ان ذاتی اور دنیاوی اضطراب کا اشاریہ ہیں، جن کے بارے میں اسپنسر نے انسانی وجود کے بعید از قیاس عنصر کا لفظ استعمال کیا ہے اور نطشہ نے فوق البشریت کا خطاب دیا ہے۔ آئن اسٹائن نے اس متعلق کہا ہے کہ ہم نے بالآخر اتنی طاقت پیدا کر لی ہے کہ خود کو تباہ کر سکتے ہیں۔ شاعری میں زندگی سے شدید محبت کے جذبات کہیں ہزیمت زدگی اور انفعالیت کے پیکر میں بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ مذہب، نفسیات، ذاتی اور روحانی مسائل، مریضانہ ڈاخلیت پسندی جیسے موضوعات میں نئی نئی جہت کے اضافے دوسری وجوہات کے ساتھ ساتھ دراصل سائنس کی معروضیت، عقلیت کی سرد مہری اور سیاست کی عدم اخلاقیت کے نقارے میں انسانی جذبات طوطی کی آواز ثابت ہوئے ہیں۔ ان حالات میں زندگی کے تقاضوں سے فرار اختیار کرنے کے تصور اور عمل سے بعض رہنے میں مذہب اور فن دونوں بڑے معاون ہوتے ہیں اور ہیں۔ رسل نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ مذہبی جستجو مفید بھی ہو سکتی ہے، بشرطہ یہ کہ عقل کے

کھرے پن کو اس سے نقصان نہ پہنچے۔ وہ مزید کہتا ہے۔

"یہ صحیح ہے کہ غیر متصوفانہ لوگوں کے ادراک سے باہر ایسی کوئی سچائی نہیں ہے، جس کا انکشاف صوفیا کر سکتے ہوں، لیکن سریت اس سچائی کو خلق بھی کرتی ہے، جس میں وہ یقین رکھتی ہے، ایک ایسے طریقے سے جس میں وہ دنیاوی حقائق مثلاً موت اور وقت کے سامنے انسان کی بے چارگی اور احساس کی اس اساسی گہرائی کا ادراک کرتی ہے جو اس وقت تک مخفی رہتی ہے، جب تک کہ زندگی کے خداؤں میں سے کوئی ہماری عبادت کا تقاضا نہ کرے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذہب اور فن دونوں کائنات کو انسانیت سے ہم کنار کرنے کی کوششیں ہیں، جن کا سلسلہ بلاشبہ انسان کو (حقیقی معنوں میں) انسان بنانے سے شروع ہوتا ہے۔ اگر سرکش حقائق میں سے چند (حقائق) کسی شعور سے الگ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو مذہب یا کوئی فن اس وقت تک اس کے لئے پوری طرح کشش انگیز نہ ہو سکے گا، جب تک کہ وہ ان حقائق کا محاسبہ نہ کرے۔ اس طرح تمام مذاہب ایک کارنامہ، ایک فتح، ایک یقین بن جاتے ہیں کہ انسان بے تاب و تواں ہو سکتا ہے، مگر اس کے مقاصد ایسے نہیں ہیں۔"

The Autobiography of Bertrand Russell, Vol.I.P.247 (بحوالہ، جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از۔ شمیم حنفی، ص، ۱۰۶)

ان خیالات کی روشنی اور ان کے نتائج کی تصویر لیاقت جعفری کے اشعار میں یوں ابھرتی ہے۔

چہرے اندر چہرے کھوج
انساں کی ہیجانی سیکھ

تو ہر ایک ہنر کو جان
ہم مانیں ، نہ مانیں ،سیکھ

بے سری ماں نے پکائی روٹیاں
اور سب بچے سریلے ہو گئے

سانپ زخمی ہوکے غائب ہو گیا
پتھروں کے ہونٹ نیلے ہو گئے

شہر کے ہر گھر میں دیواریں اٹھیں
گاؤں میں دو سو قبیلے ہو گئے

لیاقت جعفری کے یہاں اپنے عہد کے تہذیبی تصورات اور مکاتب فکر کی کئی شکلیں سامنے آئی ہیں، جن پر اظہار تخلیقی سطح پر مختلف نوعیتوں اور فنی تقاضوں کے ساتھ صیغۂ اظہار کی مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔ان کے یہاں تہذیبی افکار اور تخلیقی تجربوں کے مابین جو اندرونی ربط ہے، وہ عہد حاضر کے المیوں کو مختلف تناظر میں پیش کرتا ہے۔اس کے لئے انہوں نے جو لسانی صورتیں استعمال کی ہیں، وہ ان کے معنی ومفہوم کو پوری طرح ادا کرتے ہیں۔رسل نے لسانی اظہار کے چار بنیادی مسئلوں کا ذکر یوں کیا ہے۔

''سب سے پہلے یہ مسئلہ آتا ہے کہ جب ہم زبانوں کو کسی معنی کے اظہار کے ارادے سے استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں واقعتاً کیا وقوع پذیر ہوتا ہے، یہ مسئلہ نفسیات کا ہے۔دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خیال، لفظ، جملے اور اس حقیقت کے ما

بین ،جس کا حوالہ یا اظہار مقصود ہوتا ہے، رشتے کی کیا نوعیت
ہوتی ہے، یہ مسئلہ علم الوجود سے متعلق ہے۔ تیسرا مسئلہ جملوں کو
استعمال کرنے کا ہے، تا کہ سچ سامنے آئے ،نہ کہ جھوٹ۔ اس
مسئلے کا تعلق اختصاصی علوم سے ہے جو زیر بحث جملوں کے مافیہ
سے ربط رکھتے ہیں۔ چوتھا مسئلہ اس سوال سے منسلک ہیکہ ایک
واقعے کو (جیسے کہ ایک جملہ) دوسرے سے اس کی علامت کا
اہل ہونے کے لئے کیا رشتہ قائم کرنا چاہئے، یہ آخری سوال منطقی
ہے۔"

رسل کے اس نظریہ کی روشنی میں لیاقت جعفری کے لسانی برتاؤ کا احاطہ کیا جائے تو اکثر مقام پر مایوسی نہیں ہوتی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لیاقت جعفری کے اشعار ان کے شعری موقف کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔

غزل

نام: لیاقت حسین شاہ

قلمی نام: لیاقت نیر

ولدیت: عنایت حسین شاہ

پیدائش: ۱۷، اگست ۱۹۶۷ء

تعلیم: پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

پیشہ: اسسٹنٹ پروفیسر

تصنیف: صابر مرزا شخصیت اور فن

پتہ:

chandak,Surankote

Poonch

موبائل:

اب منتشر ہے طاقت صبر و قرار ، آ
کچھ لمحوں کی ہنسی ہے یہ ناپائدار ، آ

افسانہ آ چکا ہے اپنا اختتام پر
نبض حیات ڈوبنے والی ہے ، یار ، آ

تیرے بغیر زندگی تاریک ہے مری
ائے میرے چاند ! تو کبھی میرے دیار آ

مجھ کو جلا رہی ہے مصائب کی تیز دھوپ
اک پیڑ بن کے میرے لئے سایہ دار آ

دن بھی گزر گیا ہے ترے انتظار میں
ڈھلنے لگی ہے شب بھی ، ائے جان بہار آ

میں بھی تری تلاش میں ہوں کب سے در بدر
تو بھی مری تلاش میں بے اختیار آ

ڈاکٹر لیاقت نیر

ڈاکٹر لیاقت نیر کے یہاں روایتی اور کلاسکی شاعری کا خاص مطالعہ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار پر یہ اثرات بخوبی نمایاں ہے۔ دراصل ہر زمانے کی ذہنی فضا کے اپنے انفرادی نشانات ہوتے ہیں لیکن ان نشانات میں مطالعے کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ دوسری بات یہ کہ تخلیقی شعوری رجحان جس طرف ہوگا، انفرادی شناخت یا خاص تخلیقی روش بھی اسی جانب ہوگی۔ ان کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

اب منتشر ہے طاقت صبر و قرار، آ
کچھ لمحوں کی ہنسی ہے یہ ناپائیدار، آ

اس کے بعد کا شعر ؎

افسانہ آ چکا ہے مرا اختتام پر
بنض حیات ڈوبنے والی ہے یار، آ

تو اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں عاشق اور محبوب کے متعلق گفتگو اور اس متعلق جو کثیر موضوعات ہیں، وہ ان کی شاعری کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے اشعار میں جذباتی زندگی کی اہمیت عقلی اور منطقی فکر کی زندگی سے زیادہ ہے۔ ان کے نزدیک علم و ادب کی برتری کا فریب نظام جذبات کے فکریہ عناصر کو متاثر کرتا ہے اور اس طرح اصل حقیقت یا تو پوشیدہ رہتی ہے یا پھر آدھی ادھوری شکل میں سامنے آتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

کس دیس کو ہم چھوڑ کر کس دیس میں جائیں
اجداد کے آثار ادھر بھی ہیں، ادھر بھی

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہوا ان کا نقطۂ نظر تقسیم ہند اور تقسیم کشمیر کے سانحات کی جانب توجہ منعطف کر دیتا ہے۔ شائد اسی قسم کے تصادمات سے رونما ہونے والے اثرات کے متعلق بہت پہلے کہا گیا تھا کہ:

''فرد کا رشتہ خدا سے، اپنے آپ سے، اپنے محبوب سے،
اپنے فن یا اپنے ہنر سے باقی نہیں رہ گیا اور وہ تمام اشیا میں صرف ایک
تجرید سے نسبت کے شعور کا مالک رہ گیا۔''
(بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از شمیم حنفی، ص ر ۵۴)

لیاقت نیر کے مزید اشعار دیکھے جائیں ؎

موسم تو رنگدار ،ادھر بھی ہے، ادھر بھی
اور رقص میں تلوار، ادھر بھی ہے ،ادھر بھی
ٹوٹی ہیں کئی چوڑیاں تاریکیٔ شب میں
یہ رات گنہگار ،ادھر بھی ہے، ادھر بھی
روکے بھی بھلا کون ترے دست ستم کو
وحشت کا یہ بازار ،ادھر بھی ہے، ادھر بھی

لیاقت نیر کی اس غزل میں تقسیم خیال کی اتنی شدت ہے کہ گھوم پھر کر ذہن وہیں جا کر ٹھہرتا ہے۔ بقول صبیحہ صبا ؎

''یہ سوچ بھی کسی اہل جنوں کا لشکر ہے
گھما پھرا کے کوئی انتہا نہیں چھوڑی''

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ لیاقت نیر کے تخلیقی نقطۂ نظر نے رومانیت سے منسلک کلاسیکی انداز بھی اختیار کیا ہے۔ دراصل انہوں نے گرد و پیش کی زندگی کے تقریباً ہر مظاہر کو نظریات کی شکل میں دیکھا ہے۔ انہیں احساس ہے کہ جذباتی زندگی کے فقدان نے ایسے معاشرے کی تشکیل کی ہے جہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

بچا بچا کے ہے رکھا جسے زمانے سے
وہ شیشہ دل کا مرے آکے چور کرتا جا

ڈاکٹر لیاقت نیر کے یہاں زندگی کے مختلف حقائق رومانی رنگوں میں ملتے ہیں۔ ابھی اردو شاعری میں ان کا سفر بہت آگے تک نہیں گیا ہے تاہم ان کے اندر وہ صلاحیت موجود ہے جو گہرے مطالعے اور فکری مشاہدے کے ساتھ انہیں مستحکم شعرا کی صف میں لاسکتی ہے۔

نام: محمد نذیر قریشی

قلمی نام: ایم۔این۔قریشی

ولدیت: لعل دین قریشی

پیدائش: دوم نومبر ۱۹۴۱ء درآبہ، سرنکوٹ

تعلیم: ایم۔اے (اردو، سماجیات، نفسیات) دینیات، فارسی آنرز، عربی

تصانیف: متعدد نصابی مضامین

پیشہ: ریٹائرڈ مدرس

پتہ: Draba Tahseel Surankote Poonch

موبائل:

ایم۔این قریشی

ایم۔این۔قریشی کے تحقیقی مضامین جو کہ اردو نصاب سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور تاریخ سے بھی ،اپنی انفرادیت کے سبب پورے جموں وکشمیر میں علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ان کے مضامین کے عنوانات پر ہی نظر کی جائے تو ان کی مطالعاتی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔چند عنوان ملاحظہ ہوں۔

۱۔زبان کی تخلیق

۲۔پہاڑی اور دنیا کی زبانوں کے خاندان

۳۔ہند آریائی

۴۔پہاڑی کی اصل

۵۔پہاڑی ریاست جموں وکشمیر میں

۶۔پہاڑی اور ضلع پونچھ

نصاب کے اعتبار سے یہ مضامین اپنی اہمیت تو رکھتے ہیں،لیکن اس کے آگے بھی دیکھا جائے تو تحقیقی اعتبار سے بھی ان کی اپنی قدر و قیمت ہے۔یہ سچ ہے کہ تاریخی حقائق بے ربطی بھی رکھتے ہیں،لیکن اس بے ربطی کے رشتوں کی روشنی میں بھی اندرونی رابطے کے نقوش تلاشے جا سکتے ہیں۔اس کے لئے ضروری ہے کہ تخلیقی آنکھ،ذہن اور حواس مظاہر کے ظاہری انتشار میں نہ الجھیں اور تاریخ کے ہر مظہر کو محض اس کے خارجی تناظر کے مطالعے تک محدود کر کے رقم نہ کریں۔معروضی سطح پر بھی یہ احتیاط لازمی ہے۔جیسا کہ ایم۔این۔قریشی کی تحریروں میں اس کی دلیلیں ملتی ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''زبان کیسے،کب اور کیوں کر وجود میں آئی،اس کا کوئی قطعی زمانہ متعین کرنا اور رائے قائم کرنا مشکل ہے۔لیکن قیاس بتاتا ہے کہ ابتدائی انسان نے اپنی ذاتی،سماجی اور معاشی ضروریات

اور جذباتی کیفیات کے اظہار کیلئے جسمانی
اشاروں، تصویروں، آوازوں اور علامتوں سے کام لیا
ہوگا۔ پھران کے معنی متعین کئے ہوں گے۔ آخر میں علامتوں کو
حروف کی شکل دے کران کے نام یا آواز مقرر کی ہوں گی۔ ان
حروف کو جوڑ کر الفاظ اور جملے بنائے ہوں گے۔ اور بہت بعد
میں بول چال کی زبان نے تحریری شکل اختیار کی ہوگی۔ ایک
تحقیق کے مطابق انسان فطرت سے کوئی خاص زبان لے کر
پیدا نہیں ہوا۔"

(زبان کی تخلیق)

مندرجہ بالا اقتباس پر غور کیا جائے تو زبان کی تخلیق کے سلسلے میں نا قابل تغیر اقدار کو
اضافی قدر کے طور پر دیکھنا اس لئے مفید ہے کہ زمانی تقسیم کی تاریخ اس معاملے میں کتنی ہی گمراہ
کن یا رد وقبول سے بھری ہوئی کیوں نہ ہو، اسے حتمی طور پر قابل قبول یا نا قابل قبول نہیں ہوتی
جب تک کہ اس کے اندر خود یہ صلاحیت موجود نہ ہو کہ زمانی ومکانی سطح اور معیار سے جدا بھی سینہ بہ
سینہ اپنا الگ رنگ وآہنگ رکھتی ہو۔ ایم، این، قریشی پورے عالم میں زبانوں کے ارتقا کے سلسلے
میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دنیا میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان کی گروہ بندی دو طرح
کی جاتی ہے۔ ایک لفظی اور صرفی خصوصیات کے لحاظ سے۔ اس
کو بھی دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ ان
زبانوں کا ہے، جو یک لفظی ہیں۔ اور جن کی اساسی یعنی بنیادی
الفاظ شکلی تبدیلیوں کے ذریعہ اپنے مفہوم میں تغیر وتبدل نہیں
کرتے، بلکہ مفہوم ہر حالت میں یکساں رہتا ہے۔ ان زبانوں
میں تمام الفاظ عموماً آزاد ہوتے ہیں اور ان سابقوں اور
لاحقوں کا استعمال نہیں کیا جاتا، اوران کے بغیر ہی مفہوم واضح ہو
جاتا ہے۔ دوسرا حصہ ان زبانوں کا ہے جن میں الفاظ اپنی شکل

بدلتے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ مفہوم بھی بدلتے رہتے ہیں
۔اس کے ساتھ ہی سابقوں اور لاحقوں کے ذریعہ ان کے معانی
میں طرح طرح کے پہلو پیدا کئے جاتے ہیں۔ایک ہی لفظ
اصل یا مصدر ہوتا ہے۔اسی سے بہت سے الفاظ نکالے جاتے
ہیں اور ان سے طرح طرح کے مفہوم ادا کئے جاتے ہیں۔''
(پہاڑی اور دنیاوی زبانوں کے خاندان)

زبانوں کے تاریخی ارتقا کے معاملے میں یہ نقطہ بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ زماں کی میکانکی اور مادی تقسیم کو قبول نہیں کرتا نئی تاریخ اور پرانی تاریخ کے تناظر میں ذہنی ارتقا کے خارجی مظاہر تک ممکن ہے کہ کچھ راہیں تلاش کر لی جائیں اور طرز اظہار اور طرز احساس کی بنا پر ان کو کسی تھیوری کا نام بھی دے دیا جائے ،لیکن اپنے اندرون میں جس کا کہ بڑا دخل خارجی مظاہر کے ردو قبول کی تشکیل میں ہوتا ہے،نوعیت کے اعتبار سے اس کی تقسیم کے امکانات کسی پختہ منزل کی جانب اشارہ نہیں کرتے۔یہی سبب ہے کہ قدیم اور جدید کے مابین بھی ترسیل وابلاغ کا مسئلہ کوئی بڑی یا حتمی صورت اختیار نہیں کر پاتا۔ایم،این،قریشی کی تاریخی تحریروں سے بھی اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔اپنے آبائی ضلع پونچھ میں پہاڑی زبان کے وجود اور ارتقا کے متعلق لکھتے ہیں:

''ریاست پونچھ میں پہاڑی زبان کب سے بولی جانے لگی اور
یہ کتنی پرانی ہے، یہ ایک تحقیقی طلب مسئلہ ہے،لیکن اس زبان کا
ایک سرا آریوں کی آمد کے بعد پہاڑوں میں بسنے والیکھشہ
قبیلوں کی زبان کھس پراکرت اور آپ بھرنش سے جاملتا ہے اور
دوسرا سرا مہاراجہ اشوک کی پراکرت پالی سے۔اشوک نے
جب بدھ دھرم اختیار کیا تو اس نے بدھ مت کے پرچار کے
لئے پالی پراکرت کا استعمال کیا پالی کے علاوہ مہاراجہ اشوک
کے زمانے میں سارے پہاڑی خطے میں پہاڑی زبان رائج ہو
چکی تھی۔پہاڑی کے علمی اور ادبی ہونے کا ثبوت ہمارے پاس
شاردا پیٹھ کا قیام ہے۔''

(پہاڑی اور ضلع پونچھ)

اس مختصر مطالعے سے ایم، این، قریشی کی تخلیقی صلاحیت اور زبان پر ان کی دسترس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی ان ادھر ادھر بکھری ہوئی تحریروں کو کتابی شکل میں محفوظ کر لیں تو نہ صرف ان کے اظہارات محفوظ ہو جائیں گے بلکہ ایک بڑا طالب علم طبقہ ان سے نسل در نسل مستفیض ہوتا رہے گا۔

نمونہ کلام

نام: محمود الحسن محمود
قلمی نام: محمود
پیدائش: ۷، جولائی ۱۹۳۷ء، پونچھ
تعلیم: بی۔اے۔بی،ایڈ
پیشہ: ریٹائرڈ مدرس
تصنیف: متاعِ خیال (شعری مجموعہ)
پتہ: Khori Naar Ward No.8
Tehseel Haveli Dist. Poonch

غزل

اوج پر فکر مبیں ہو تو غزل ہوتی ہے
موجزن دل میں یقیں ہوتو غزل ہوتی ہے

رو برو پردہ نشیں ہوتو غزل ہوتی ہے
دل کو تسکین کہیں ہو تو غزل ہوتی ہے

شعر ہوتا ہے رقم خونِ جگر سے لیکن
ذوق شاعر کا حسیں ہوتو غزل ہوتی ہے

محض الفاظ سے ہوتی نہیں تخلیق اس کی
عشق بھی دل میں مکیں ہوتو غزل ہوتی ہے

شعر گوئی پہ جنہیں ناز ہے، اتنا سن لیں
میر و غالب کی زمیں ہوتو غزل ہوتی ہے

محمود الحسن محمود

محمود الحسن محمود غزل کی کلاسیکی روایت کے امین ہیں۔انہوں نے جس دور میں شاعری کی ابتدا کی کم از کم ریاست پونچھ کے قرب وجوار میں اس وقت زیادہ تر کلاسیکی ماحول ہی تھا۔محمود الحسن محمود جب یہ کہتے ہیں کہ ؎

شعر گوئی پہ جنہیں ناز ہے اتنا سن لیں
میر و غالب کی زمیں ہو تو غزل ہوتی ہے

تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست پونچھ کے شعری منظر نامے میں تغیر وتبدل کے بعد بھی وہ ہمیشہ کلاسیکی اور روایت کو مقدم سمجھتے رہے اور آج بھی جب وہ شعر گوئی کی جانب مائل ہوتے ہیں تو ان کا تخلیقی ذہن کہتا ہے کہ ؎

رو برو پردہ نشیں ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کی تسکین کہیں ہو تو غزل ہوتی ہے

حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہ دور تسکین کا نہیں بلکہ اضطراب کا ہے۔بہر حال محمود الحسن محمود کے فن پر عبور کی بات کی جائے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور جو بھی موضوع اپنے شعر میں اختیار کرتے ہیں اس کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں اور پورے فنی تقاضوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے ہیں۔ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شعر کے طے شدہ نتیجے کے طور پر اپنا موقف اضح طور پر عیاں کر دیتے ہیں۔اس غزل ،جس کے دو شعر میں نے اوپر نقل کئے ہیں، کے باقی اشعار بھی اسی رومانی نوعیت کے ہیں جن میں غزل کے مفہوم و معنی کو ایک عشق و محبت سے سرشار اور اس کے فوائد جن میں عالمی امن اور عالم انسانیت کی بقا کی کلید بھی پوشیدہ ہے، سے واقف تخلیق کار کے نظریۂ حیات کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔لیکن یہاں یہ بھی غور کرنا ضروری ہے کہ یہ وہ عمومی لفظیاتی عمل نہیں ہے جس کے بارے میں

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''مضامین عاشقانہ ہیں، جس میں کچھ وصل کا لطف، بہت سے حسرتو ارمان، اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دور دور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سر گزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں اور یہ شاعری جو چند محدود احاطوں بلکہ زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے، اگر آزاد نہ کی گئی تو ایک زمانہ ایسا آئے گا جب اردو زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی اور اس مخر آزمائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہوگا۔''

(نظم آزاد، ص ۵)

محمود الحسن محمود کے باقی اشعار کو دیکھا جائے تو مطلع ہی محمد حسین آزاد کے بیان کردہ نظریہ کے دائرے سے باہر ہے۔ اوج پر فکر مبیں اور فکر مبیں اوج پر ہے، اس کا یقین دل میں موجزن ہو تو ظاہر ہے کہ غزل کیا کوئی بھی فن ہو، کامیابی ملے گی۔ اسی طرح کوئی بھی عمدہ اور لازوال شعر خواہ وہ رومانی ہو یا رجحانات کے حوالے سے کلاسک، ترقی پسند، جدید یا پھر مابعد جدید ،اس کی تخلیق میں خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے، یعنی بقول فراق انتہایوں کے سلسلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور اس میں ذوق حسیں بمعنی پورا انہماک لازمی ہے۔ اسی نقطے کو اپنے مخصوص انداز میں شاعر نے اگلے شعر میں آگے بڑھایا ہے کہ عشق بھی دل میں مکیں ہونا چاہئے۔ اگر اس نظریہ میں غالب ،میر کے ساتھ اقبال کے نظریہ کو بھی شامل کر لیا جائے جو کہ عشق کے مختلف معنوں کی آئینہ داری کرتا

ہے، پھراس سے آگے بھی غور کیا جائے تو محمود الحسن محمود کے وسیع تخلیقی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔اس طرح غور کیا جائے تو ان کی شاعری محض رسمیت زدگی والی شاعری نہیں ہے۔ان کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں لہجہ تو ان کا مخصوص نرمی والا ہے لیکن جو بات وہ کہتے ہیں وہ نہ صرف پرانے عہد بلکہ آج کے عہد پر بھی صادق آتی ہے۔اس طرح ان کے تخلیقی موضوعات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ایک مطلع ملاحظہ ہو۔

سینے میں حادثوں کو سپر کر لیا کرو
یہ کام ہے کٹھن سا ،مگر کر لیا کرو

ظاہر ہے کہ اس شعر کو کسی مخصوص عہد میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔اس کی پھیلی ہوئی معنوی جہتوں میں سے ایک جہت وجودیت کی جانب بھی جاتی ہے کہ سینے میں حادثوں کو سپر نہ کرنے کی صورت میں کیا انسانی وجود کے ٹوٹنے ،بکھرنے کا بھی خطر ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر ان حالات میں وجودیت کن معنوں اور کس نہج پر اپنا تحفظ کر سکتی ہے۔اس طرح نہ صرف محمود الحسن محمود کی تخلیقی حس کا سراغ لگایا جاسکتا ہے بلکہ وجودیت کی مختلف معنوی جہتوں جس کی جانب سارتر Sartre نے اشارہ کیا ہے،اس کا بھی سراغ ملتا ہے۔سارتر نے لکھا ہے۔

''وجودیت کو سمجھتے وقت جو بات معاملات کو الجھا دیتی ہے ،یہ ہے کہ وجودیت پرستوں کی دو قسمیں ہیں ۔ایک وہ جو عیسائی ہیں ،جن میں یاس پرس اور گیبریل مارسل کو شامل کرتا ہوں ۔،دوسرے دہری وجودیت پرست جن میں ہائیڈیگر پھر فرانسی وجودیت پرستوں اور پھر خود کو رکھتا ہوں ۔ان میں جو بات مشترک ہے، یہ ہے کہ ان سب کے خیال میں وجود عین (جوہر) پر مقدم ہے اور یہ کہ داخلیت کو وجود (کی دریافت) کا نقطہ ٔ آغاز ہونا چاہئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وجودیت کو انجماد کا فلسفہ نہیں کہا جاسکتا ،کیوں کہ یہ انسان کی تعریف عمل کی اصطلاحوں میں کرتا ہے۔نہ ہی اسے انسان کی قنوطی دستاویز کہا جاسکتا ہے۔اس سے زیادہ رجائی نظریہ کوئی نہیں ،کیوں کہ

انسان کا مقدر اسی میں مضمر ہے، نہ ہی اسے انسان کے عمل کو
پست کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ اسے
بتاتا ہے کہ امید صرف عمل میں ہے اور یہ کہ عمل ہی وہ تنہا شئے
ہے جو انسان کو زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے۔"

محمود الحسن محمود کی اس غزل کے بھی اشعار دیکھیں جائیں

جن پر ہوں مشکلات کے سائے پڑے ہوئے
ان منزلوں میں عزم سفر کر لیا کرو

غیروں پہ نکتہ چینیاں کرنے سے پیشتر
اپنی قباحتوں پہ نظر کر لیا کرو

اے گلشن حیات کے پھولوں کے عاشقو!
کانٹو میں بھی کچھ وقت بسر کر لیا کرو

فکر معاش اور غم زندگی کے ساتھ
ذکر خدا بھی شام و سحر کر لیا کرو

آخری کا شعر پڑھتے ہوئے کسی شاعر، جس کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے، کا شعر بے ساختہ یاد آتا ہے۔

"فکر معاش، عشق بتاں یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے"

اس شعر میں جو سوال ہے، محمود الحسن محمود کا شعر اس کا جواب بھی معلوم ہوتا ہے۔ ان کی قادر الکلامی یہ ہے کہ انہوں نے فکر معاش کے علاوہ عشق بتاں اور یاد رفتگاں کے ساتھ ساتھ زندگی

کے تمام مسائل جن کو غموں سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کو صرف ''غم زندگی'' کہ کر اپنے شعر میں برت کر اپنی فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ممکن ہے ان کی نظر سے یہ شعر گزرا ہو اور اس کے جواب میں ہی انہوں نے یہ شعر کہا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی پڑھا ہو یہ شعر لاشعور میں پیوست ہو گیا ہو اور تخلیق کرتے وقت انہیں یہ شعر یاد بھی نہ رہا ہو۔ بہر حال صورت کوئی بھی ہو، یہ شعر اور ان کی اس قسم کی شاعری ان کی مطالعاتی وسعت پر بھی دال ہے۔ اس قسم کی اشعار محمود الحسن محمود کے اردو ادب میں وزن و وقار کے ضامن ہیں۔

نام: مسعود الحسن
قلمی نام: مسعود
پیدائش: ۲۳ ،جنوری ۱۹۴۰ء، کھوڑی
ناڑ، پونچھ
تعلیم: میٹرک
پیشہ: پولس میں ہیڈ کانسٹبل رہے

نمونہ کلام

غزل

دل کو سکون ہے نہ خوشی ہے ترے بغیر
محفل تمام سونی پڑی ہے ترے بغیر

گلشن کے دل فریب مناظر پہ ان دنوں
اک مردنی سی چھائی ہوئی ہے ترے بغیر

مر جایئے کہ چار گھڑی اور دیکھئے
اب زندگی یہ سوچ رہی ہے ترے بغیر

تو ہی نہیں جو، جشن بہاراں کو کیا کروں
ہر اک خوشی میں طرفہ کمی ہے ترے بغیر

آ جایئے کہ جان سے جانے لگے ہیں ہم
نبض حیات آج کھڑی ہے ترے بغیر

مسعود الحسن مسعود

مسعود الحسن مسعود وادیٔ پیر پنچال کے ان شعرا میں تھے، جنہیں استاد کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے بہت سی غزلیں استاد شعرا کی زمین میں کہہ کر یہ دکھلایا کہ اپنے رنگ میں جب کسی مشہور ردیف یا مشہور قافیہ میں غزل کہی جاتی ہے تو اس میں اپنی شناخت کیسے قائم کی جاتی ہے۔ ان کی غزل جس کی ردیف ''ترے بغیر'' ہے، پر اردو ادب میں نہ جانے کتنی غزلیں کہی گئی ہیں لیکن جب مسعود الحسن مسعود جیسا قادرالکلام شاعر اس کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے تو صنعت تضاد اور مسجع عبارتوں کے ایسے ایسے جوہر سامنے آتے ہیں، جو کلاسکی شاعری کے حسن کو دوبالا کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسکی شاعری میں برتے جانے والے الفاظ کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتے ہیں ۔جیسے ان کا یہ شعر ہے۔

مر جایئے کہ چار گھڑی اور دیکھئے
اب زندگی یہ سوچ رہی ہے ترے بغیر

یہاں ''مر جایئے'' کے حسن کو صرف ''کہ'' کی اضافت نے دوبالا کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ وزن کی مجبوری ہو، لیکن اس کو بھی کس قدر نفاست سے برتا گیا ہے کہ پہلا مصرعہ مہذب خیالی اور عملی تہذیب کا ایک مرقع بن کر سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں تخلیقی تجربے کا بھی عمل دخل موجود ہے، لیکن اسے کہنہ مشقی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کی زیادہ تر بہترین غزلیں جوان کے آفاقی وقار کی ضامن ہیں ''نسخہ حمیدیہ'' میں موجود ہیں، جو انہوں نے پچیس برس کی عمر میں ترتیب دیا تھا۔ جدید دور میں بانی، شکیب جلالی وغیرہ کی اولین دور کی غزلیں دلیل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تجربے کے لئے طویل عمر کے فاصلے طئے کرنا لازمی نہیں ۔کشادہ ذہن کبھی بھی اسے اخذ کر سکتا ہے۔ سوال اٹھ سکتا ہے کہ مسعود الحسن مسعود کے اسی شعر کے دوسرے مصرے میں وہ مہذب خیالی اور عملی تہذیب نہیں ہے۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شعر کو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو دوسرے مصرعے میں وہ تہذیب خیالی اور عملی تہذیب برتنا ممکن نہیں

ہے، یا اگر ممکن ہو بھی تو وہ تاثیر پیدا نہ ہو سکے گی جو کہ پہلے مصرعے کے انسلاک کی اس صورت میں موجود ہے۔ پھر تجربے کا بہاؤ یکساں ہو، یہ کوئی ضروری نہیں۔ کلیم الدین احمد نے بہت عمدہ بات کہی ہے۔

''تجربے کو ایک چشمہ سمجھئے۔ اس چشمے کا پانی ایک طرح سے نہیں بہتا۔ کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ۔ کبھی ایسا نرم سیر ہوتا ہے جیسے کہ آب ہو۔ کبھی ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں تو کبھی یہ لہریں بلند ہو جاتی ہیں اور کبھی بھنور کی کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ نظر آتی ہے۔ کبھی دھیمی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے تو کبھی آواز کی لے تیز ہو جاتی ہے۔''

مسعود الحسن مسعود کی شاعری میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں بھی موجود ہے۔ خود کی ناکامی اور دوسروں کی کامیابی کے اسباب تلاش کرنا مشکل امر ہے۔ اسی طرح دنیا کی بے ثباتی ،ایک ملک کا دوسرے ملک پر ظلم وستم اور وہ بھی زندگی بھر کی اشائس کے لئے جس کی عمر کچھ سالوں تک محدود ہے، کئی سوال پیدا کرتی ہے ، خاص طور سے شاعر کے ذہن میں کہ جب تھوڑی سی مشقت کے بعد جب پوری دنیا کے لوگ ایک دوسرے کی امداد کے ساتھ خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں تو حرص و ہوس میں پھنس کر دوسروں کی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی اجیرن کیوں کئے ہوئے ہیں۔ بقول شاعر۔

جس آگ کو ہمسائے نے دے دی ہیں ہوائیں
اس آگ میں جل سکتا ہے ہم سائے کا گھر بھی

لیکن جابر ملکوں کے ذہن میں یہ بات کہاں؟ یہ اور اس قسم کے کئی سوالات مسعود الحسن مسعود کی ایک غزل کے اشعار میں بہترین طریقے سے برتے گئے ہیں۔ غزل خدمت میں حاضر ہے۔

ہماری ہر سعی ناکام کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

کسی پر پے بہ پے انعام کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

مقدر مسئلہ "وتنام" کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے
پریشاں آج "انکل سام" کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

کسی کے روز و شب آہ و فغاں میں صرف ہوتے ہیں
کسی کے بخت میں آرام کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

کسی کے سامنے آغاز ہی آغاز ہے لیکن
ہمارے سامنے انجام کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

بغیر اس کی رضا کے ، گر کوئی پتہ نہیں ہلتا
بشر پھر مورد الزام کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

ادھر جذبے محبت کی فراوانی کا یہ عالم
ادھر الفت برائے نام کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

سراپا جرم ہیں پھر بھی خدا سے ڈرنے والوں میں
سر فہرست اپنا نام کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

اس غزل میں ایک شعر جو کہ بہت معنی خیز ہے اور میرے خیال میں لاجواب ہے، وہ ہے شعر نمبر ۵۔ یعقوب تصور کا شعر ذہن میں آتا ہے۔

سامنے بت کے دعا کی بھول ہو جائے تو پھر؟
اور پھر وہ ہی دعا مقبول ہو جائے تو پھر؟

لیکن ظاہر ہے کہ اس کائنات بیکراں میں بہت سے سوال ایسے ہیں جن کا کوئی جواب

ممکن نہیں ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے کیا خوب کہا ہے۔

کئی سوال ہیں اب بھی ایسے ،جن کا کوئی جواب نہیں
پوچھنے والا پوچھ کے ان کو اپنا دل بہلاتا ہے۔

لیکن ان سوالوں تک رسائی ہی میرے خیال میں تخلیق کار کے حیات وکائنات کے سلسلے میں دور تک سنجیدگی سے غور وفکر کی ضامن ہیں۔ مسعود الحسن مسعود نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ اگر ان کی زندگی طویل ہوتی تو مزید بہترین ادبی اساسے کے امکانات یقیناً تھے۔ پھر بھی جو کچھ انہوں نے اردو ادب کو دیا ہے، وہ اردو ادب میں ان کی قدر و قیمت کے تعین میں بیحد معاون ہے۔

نام: مستور احمد ملک
قلمی نام: شاد
ولدیت: خواجہ رمضان
پیدائش: ۲۸، جنوری ۱۹۶۰ء بفلیاز
تعلیم: انڈر میٹرک
پیشہ: سرکاری ملازمت
ذریعہ اظہار: اردو، پہاڑی، گوجری
پتہ: Shabnam Medicate
Surankote Poonch

نمونہ کلام

غزل

خالی کمرہ، ڈر لگتا ہے
وحشت کا منظر لگتا ہے

اب کے کیسی فصل اگی ہے
پھول بھی اب پتھر لگتا ہے

اس کی بات میں زہر ہو جیسے
ایسا کیوں اکثر لگتا ہے

چاند کی لو میں اس کو دیکھا
میلی سی چادر لگتا ہے

ناداں ہے خود ہی سنبھلے گا
آج اگر بے پر لگتا ہے

مستور شاد

مستور شاد کی شاعری میں جو ایک مایوسی کی فضا محسوس ہوتی ہے، وہ ان کے دونوں قسم کے اشعار میں موجود ہیں، یعنی جن میں انہوں نے رومانی جذبات کی عکاسی کی ہے اور دوسرے وہ جن میں انہوں نے غم دوراں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ نالہ آفرینی کے مختلف اظہارات جہاں جمالیات کے مختلف دروں کی جانب ذہن راغب ہوتا ہے، مستور شاد کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ناصر کاظمی نے نالہ آفرینی اور مایوسی کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"نالہ آفرینی جبر و اختیاری ایک انوکھا کرشمہ ہے۔ قاری کے دل میں جگہ پانا بھی محض اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ آواز قوی ہو تو دور پہنچ جاتی ہے، نحیف ہو تو حلق سے باہر ہی نہیں نکلنے پاتی۔ صرف پہنچنے کی بات نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن سکتی ہے یا نہیں۔ محض ہزاروں کا ذکر کرنے یا ہزاروں کو مخاطب کرنے سے ان کی دھڑکنیں اور لرزشیں ساز کی ہمنوائی نہیں کر سکتیں۔۔۔۔۔۔۔نالہ محفلیں برہم نہیں کرتا۔ نالہ آفریں پہ جو کچھ بھی گزری ہو، اس کی فریاد فن کے سانچے میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ، پکار ہے" (برگ نے، ص، ۷)

مستور شاد کے کلام جو اب تک میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں نالہ آفرینی کی جو خصوصیات اختر الایمان نے بیان کی ہیں، موجود ہیں۔ دلیل کے طور پر ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو۔

کہاں ہیں برف پہ خوشبو کی تتلیاں اب کے
سراپا آگ ہیں خوابوں کی بستیاں اب کے
ہیں کیسی تیز ہواؤں کی زد پہ گل سارے
سسک رہی ہیں گلابوں کی پتیاں اب کے

ترے خرد کا کہاں کھو گیا ہے آج لباس
جنوں کے ہاتھ سے اڑتی ہیں دھجیاں اب کے

یہ کون خوش ہے فضاؤں سے توڑ کر رشتے
بھٹک رہی ہیں ہواؤں کی تتلیاں اب کے

لہولہان ہے دھرتی، ہے آسماں خوں ریز
عجیب تر ہیں یہ آدم کی مستیاں اب کے

تمہارا کرب لکھوں میں، مگر لکھوں کیسے
لرز رہی ہیں ان ہاتھوں کی انگلیاں اب کے

ڈبو کے خون میں تاریخ داں نے اپنا قلم
جبین وقت پہ لکھ دی ہیں سرخیاں اب کے

بجھا کے کون گیا ہے یہ منظروں کے چراغ
اداس شاد ہیں ساری ہی بستیاں اب کے

اس پوری غزل کا باریکی سے مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ اشعار عبث ہی تفنن طبع کے لئے نہیں کہے ہیں۔ پہلے شعر میں برف کا تذکرہ کر کے انہوں نے اپنی جنت بے نظیر مٹی کے حالات بیان کئے ہیں، اس کے دوسرے مصرعے میں خوابوں کی بستیوں کا سراپا آگ ہونا بالکل بگڑے ہوئے اور منتشر حالات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں گل اور گلاب کی پتیوں کا تذکرہ، اس ارض پیر پنچال کی خوش نما اور صدا بہار وادی کی روشن تاریخ کا اشاریہ ہے۔ اسی طرح اس غزل میں ایسے بھی اشعار ہیں جن میں آفاقیت نمایاں ہے۔ جو کہ پوری

انسانی زندگی اور انسانی بستی کا احاطہ کرتے ہیں۔ایک شعر ملاحظہ ہو۔

لہولہان ہے دھرتی، ہے آسماں خوں ریز
عجیب تر ہیں یہ آدم کی مستیاں اب کے

''آدم کی مستیاں'' مستور شاد کی گہری سوچ کی ایجاد ہے۔واقعی اگر غور کیا جائے تو آدم خاکی یہ تمام خرافات جو کہ آخر کار اس کی بربادی کا باعث ہیں،کو کرنے میں ایک طرح کی مستی اور انبساط ہی محسوس کرتا ہے۔مستور شاد کی مٹی وادیٔ بے نظیر جس قسم کے حالات سے کافی دنوں سے دو چار ہے ،اس پر مجھے رسل کا ایک خط یاد آتا ہے جو اس نے کولیٹ کے نام ۲۸، دسمبر ۱۹۲۸ء کو لکھا تھا۔اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے۔

''ملائم اشیا اس دہشت میں مر جاتی ہیں،اور ہماری محبت کو یہ دور اپنی زندگی کے لہو کی خاطر جھیلنا ہے۔میں دنیا سے کم وبیش اس کے تمام مکینوں سے نفرت کرتا ہوں۔میں لیبر کانگریس اور ان صحافیوں سے نفرت کرتا ہوں جو انسانوں کو مرنے کے لئے بھیج دیتے ہیں، اور ان باپوں سے بھی جو بیٹیوں کے قتل ہونے پر ایک چھپا ہوا فخر محسوس کرتے ہیں،حتیٰ کہ ان امن پسندوں سے بھی جو اس کی مخالف شہادتیں پانے کے بعد بھی یہ رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ انسان فطرتاً نیک خو ہے۔میں اس سیارے سے اور نسل انسانی سے نفرت کرتا ہوں۔مجھے شرم آتی ہے کہ میں ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتا ہوں۔''

چند جذباتی جملوں سے قطع نظر کیا آج کے دور کے سنجیدہ تخلیق کاروں کا یہ المیہ نہیں ہے؟ کیا انہیں اس کا غم اور شرم نہیں ہے کہ ان کے پوری پوری زندگی امن وآشتی اور انسانی فلاح وبہبود کے لئے صرف ہوگئی اور ہوتی جارہی ہے،لیکن سب کچھ جاننے ،سمجھنے اور ان کے نظریات سے راضی بہ رضا ہونے کے باوجود زمانہ ان کی نہیں سن رہا ہے۔؟ یہی المیہ مستور شاد کا بھی ہے،اور جب تک دنیا میں ایسے حالات رہیں گے،مستور شاد جیسے تخلیق کار مضطرب رہیں گے۔

نمونہ کلام

نام: احتشام بٹ
قلمی نام: محتشم
ولدیت: صفدر علی بٹ
پیدائش: یکم جون ۱۹۷۱ء منڈی پونچھ
تعلیم: انٹرمیڈیٹ
پیشہ: کمپیوٹر آپریٹر
پتہ: Ward No.4 Mohalla Khori Naar Poonch
موبائل:

غزل

درد تھا، آزمائشیں ہوتیں
دل اگر تھا تو خواہشیں ہوتیں

دل کے جذبات دل کی دولت تھے
یوں نہ ان کی نمائشیں ہوتیں

ہم سر عام بک گئے ہوتے
دام لگتے، ستائشیں ہوتیں

چھانتا کیوں میں خاک صحرا کی
جو دلوں میں رہائشیں ہوتیں

محتشم احتشام

محتشم احتشام کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خوابوں کی گفتگو کے بجائے حقیقت پر توجہ کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ انسانی صورت حال کے بہت سے زاویے ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مادی اور سماجی ترقی کی بنیاد پر انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا انحصار نہیں ہے۔ آج کے سب سے ترقی یافتہ ملک کی بات بھی کی جائے تو بقول احتشام محتشم، کیا وہاں اس قسم کے احساسات نہیں پنپتے۔؟

دل کے جذبات دل کی دولت تھے
یوں نہ ان کی نمائشیں ہوتی

ہم سر عام بک گئے ہوتے
دام لگتے، ستائشیں ہوتی

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی شاعری کا رشتہ ماضی کی پوری روایت سے منقطع ہو گیا ہے، بلکہ الفاظ کا انتخاب اور طرز عمل بتاتا ہے کہ نئی اور بدلی ہوئی حقیقت یا نئے دور کی حقیقت نگاری کے باوجود ان کے یہاں ماضی کی روایت موجود ہے۔ چند اشعار۔

وہ جو پلکوں کو کئے اشکوں سے تر رکھتے ہیں
کیا مری طرح کوئی درد جگر رکھتے ہیں؟

یہ خبر ہے کہ نہیں آئیں گے وعدہ کر کے
ان کے آ جانے کی امید مگر رکھتے ہیں

جیسا کہ میں نے عرض کیا محتشم کے یہاں دینی اور دنیاوی موضوعات کے اظہار کا دائرۂ

کار وسیع ہے۔انہوں نے بیرونی حوادث میں خود کو شامل کرتے ہوئے ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کی طرز پر زمان و مکاں کے متعلقات سے منسلک کر کے خود کو ذات تک محدود نہیں رکھا ہے۔دینی اقدار پر پختہ اعتقاد ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

منسلک جن سے ہو تم محتشم جی ،وہ تو
در پہ تاروں کو بلانے کا ہنر رکھتے ہیں

محتشم نے عقلیت کی سرد مہری اور سیاست کی عدم اخلاقیت کے جو اثرات عام زندگیوں پر پڑے ہیں اور پڑتے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ کوئی بھی اعلیٰ سے ادنیٰ طبقہ کسی نہ کسی مثبت یا منفی صورت میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔انسان کے جذباتی اور اعصابی نظام تک اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔محتشم نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم نے تقدیر ہی کچھ ایسی ہے پائی یارو!
وہ زمیں ہٹتی ہے ،ہم پاؤں جہاں رکھتے ہیں

اس قسم کے اشعار ان کی فکر اور عمل کی اضطراری کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔زندگی کی بے حرمتی کا یہ احساس ممکن ہے ان کی ذاتی زندگی کا نوحہ ہو، ممکن ہے ایسا نہ ہو اور یہ کیفیات ماحول و معاشرے کی مثبت و منفی اقدار کے ردو قبول کی کشمکش کے تخلیقی ذہن پر نقش ہو جانے کا عطیہ ہو، بہر حال یہ ثابت ضرور ہوتا ہے کہ محتشم کے نزدیک مظاہر کی دنیا میں زندگی کی ناکامی ،زندگی کے نئے امکانات کی جستجو میں انہیں وجود کے پر اسرار خانوں تک بھی لے جاتی ہے، اور وہاں بھی جب مایوس کن حالات محسوس ہوتے ہیں تو داخل اور خارج دونوں کی رہنمائی کے اسباب کو نشان زد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کیا لکھوں؟ کیوں کر لکھوں؟ کیسے لکھوں ؟میں محتشم
بے سرو ساماں پڑا ہوں ،رہبروں کے شہر میں

یہاں سارتر کے ایک ڈرامے ''مہلت قبل سزائے موت'' reprieve کا میتھیو کے الفاظ یاد آتے ہیں۔

''ایک انسانی وجود کے لئے ''ہونے'' کا مطلب اپنے آپ کو منتخب کرنا (پہچاننا) ہے۔اسے نہ تو اپنے خارج سے کچھ ملتا ہے

نہ اپنے اندرون سے ، جسے وہ وصول یا قبول کر سکے ۔پس
آزادی (بجائے خود) ہستی نہیں ہے۔ یہ انسان کی ہستی
ہے۔یعنی (گردوپیش کی دنیامیں نہ ہونا۔''

ظاہر ہے کہ جب دنیا سے تخلیقی ذہن کا وہ سروکار نہ ہو،جس کا وہ آرزومند ہو،تواس کے لئے داخل اور خارج کا ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا،محتشم کے دوشعر ملاحظہ ہوں۔

آیئنے لے کے چلا ہوں پتھروں کے شہر میں
ڈھونڈنے کوگھر چلا ہوں، بے گھروں کے شہر میں

ہر طرف بربادیاں ہیں، ہر طرف لاشوں کا ڈھیر
سر بچانے جا رہا ہوں ،خنجروں کے شہر میں

کر کے برباد کئی گاؤں،ہوا ہے آباد
غور سے سنئے تو آواز نگر دیتا ہے

مندرجہ بالا آخری شعر میں گاؤں کے شہر میں تبدیل ہونے کے جو حقائق محتشم نے بیان کئے ہیں، مجھے ربندرناتھ ٹیگور کے الفاظ یاد آتے ہیں کہ اپنا شہر لے لو اور ہمیں ہمارا گاؤں واپس دے دو۔ ممکن ہے محتشم کی نظر سے بھی ٹیگور کے یہ الفاظ گزرے ہوں، یا نہ گزرے ہوں، اہم بات یہ ہے کہ سنجیدہ فکری ذہن اپنی اپنی فکری صلاحیت کے اعتبار سے ہر اس موضوع پر غور کرتا ہے جس سے انسانی زندگی متاثر ہوتی ہے،اور بلاشبہ محتشم احتشام ایسی ہی سنجیدہ فکر رکھنے والے شاعر ہیں۔

نام: مسرت جبیں

پیدائش: ۲۲، نومبر ۱۹۸۸ء سرنکوٹ

ولدیت: قاضی محمد اکرم

تعلیم: پی۔ایچ ڈی (عربی)

پیشہ: اسسٹنٹ پروفیسر

تصنیف: ''میزان'' (مضامین کا مجموعہ)

پتہ: Dept.of Arabic Govt. Degree College Surankote Poonch

موبائل: 9086185170

مسرت جبیں

مسرت جبیں خطۂ پیر پنچال کی ابھرتی ہوئی بہترین نثر نگار ہیں ۔انہوں نے عربی زبان میں پی ۔ایچ ڈی کی ہے،لیکن ان کا رجحان اردو کی جانب بھی اتنا ہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بعض عربی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا اور ان میں سے بعض رسائل میں شائع بھی ہوئے۔انہوں نے ان تمام اردو مضامین کو کتابی شکل دی اور اہل ادب کے سامنے پیش کر دی۔کتاب میں شامل مضامین کی فہرست یہ ہے۔

۱۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔۔حیات وخدمات

۲۔غلام علی آزاد بلگرامی ۔۔عربی ادب کا درخشندہ ستارہ

۳۔مولانا انور شاہ کشمیری ۔۔ایک عہد ساز شخصیت

۴۔نواب صدیق حسن خان ۔۔ایک ہمہ جہت شخصیت

۵۔علامہ فضل حق خیرآبادی ۔۔ایک جید عالم

۶۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور فن حدیث

۷۔مولانا ذوالفقار علی دیو بندی اور ان کی خدمات

۸۔فیض الحسن سہارنپوری۔ایک عظیم شاعر

۹۔مولانا ابوالکلام آزاد۔۔ذات وجہات

۱۰۔ماں ۔پیاری ماں

۱۱۔ذہنی اور جسمانی نفاست ۔پیغمبر اسلام کی نظر میں

۱۲۔حضرت علی کرم اللہ وجہ خلیفہ چہارم کی برگزیدہ شخصیت

۱۳۔ شیخ الاسلام امام ابن تمیمہ۔ ایک عظیم مصلح

۱۴۔ نذیر قریشی ''سفر سعید'' میں روبرو

۱۵۔ علامہ سید غلام مصطفی بخاری کی کتاب

۱۶۔ اردو زبان سیکولرزم کی علامت

۱۷۔ اردو زبان، عوام اور حکومت

اس کتاب کے ''حرف آغاز'' میں لکھا ہے۔

> ''مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ یہ نہ تو کوئی تحقیقی کارنامہ ہے اور نہ تنقیدی۔ البتہ اس میں اتنی محنت ضرور کی گئی ہے جتنی میرے بس میں تھی۔'' (ص۔۷)

مسرت جبیں نے جس انکساری کے ساتھ اپنی کتاب میں شامل مضامین کے متعلق اظہار کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمام مضامین جو شخصیات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں ان شخصیات کے حیات اور کارناموں پر تبصراتی گفتگو ہے۔ دوسرے مضامین بھی تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ ان میں تنقیدی عناصر یا تو نہ کے برابر ہیں یا پھر بہت کم ہیں۔ اس لئے تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی گفتگو کا امکان میرے خیال سے یا تو نہ کے برابر ہے یا بہت کم۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے متعلق مسرت جبیں لکھتی ہیں۔

> ''ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا آج جو کچھ نظر آتا ہے اور یہ اردو اور انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں، ان کے اجر و ثواب کا جزو اعظم یقیناً شاہ صاحب کے حسنات میں لکھا جائے گا کہ یہ سارے چراغ اس چراغ سے روشن ہوتے ہیں۔ اگر اس کی ابتدا آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے نہ کر جاتے تو نہ شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ وجود

میں آتا، نہ شاہ عبد القادر کا، اور متأخرین کا تو ذکر ہی کیا۔'' (ص۔۱۱)

ایک بہت اہم واقعہ جس کا ذکر مولانا ڈاکٹر شفیق اجمل قادری نے اپنی کتاب ''امام احمد رضا اور دیگر علمائے اہل سنت کی علمی وادبی خدمات'' میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''بعض ارباب تحقیق کے مطابق کچھ لوگوں نے ایک منظم سازش کے تحت کتابیں لکھ کر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خاندان سے منسوب کر کے شائع کیں اور ان کی اصل کتابوں کی عبارتوں کو بھی بدل کر شائع کرایا۔ محققین نے بہت سی جعلی کتب کی نشان دہی کی ہے۔ مشہور محقق مولانا یٰسین اختر مصباحی اس تعلق سے یوں رقم طراز ہیں۔

'افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے افکار مسخ کرنے اور آپ کی شخصیت مجروح کرنے کے لئے علماے سوء نے آپ کی کتابوں میں تحریف والحاق کی مذموم حرکت کی ہے بلکہ البلاغ المبین، تحفۃ الموحدین وغیرہ مستقل کتب ورسائل لکھ کر آپ کے نام سے شائع کرنے کا سنگین جرم روا رکھا ہے۔ اس لئے آپ کے صحیح نظریات وخیالات سے آگاہی کیلیے القول الجلی، انفاس العارفین۔ فیوض الحرمین، الدر الثمین، القول الجمیل، الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ جیسی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جانا چاہیے۔'

محققین کے ذریعہ شاہ صاحب کی جن جعلی کتب کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ یہ ہیں۔

۱۔ قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین

۲۔ بلاغ المبین

۳۔ جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ

۴۔ تحفت الموحدین

۵۔ اشارۃ مستمرہ

۶۔ قول سدید

۷۔ رسالہ اوائل

۸۔ فیض عام

(ص۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰)

بہر حال مصنفہ کے اس اعتراف کے بعد کی یہ ان کی یہ پہلی تحقیقی کاوش ہونے کے باوجود کوئی تحقیقی کارنامہ نہیں ہے، اس پہلی کاوش کے انکسر انہ مطالعے کا جواز ضرور فراہم کرتا ہے۔

نام: نذیر حسین قریشی
قلمی نام: نذیر قریشی
ولدیت: قاضی محمد بدرالدین قریشی
پیدائش: ۱۹، مارچ ۱۹۴۰ء گورسائی، تحصیل مہنڈر
تعلیم: بی۔اے۔بی۔ایڈ
پیشہ: ریٹائرڈ ضلع ایجوکیشن پروجکٹ آفیسر
ذریعۂ اظہار: اردو، انگریزی، پہاڑی
پتہ: Gursai Tehseel Mehndar Poonch

نذیر حسین قریشی

نذیر قریشی خطہ پیر پنچال کے ان نثر نگاروں میں ہیں جن کو زبان داں کہا جاسکتا ہے۔ادب کے مطالعے کا ذوق اتنا ہے کہ کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو اس سے منسلک موضوعات کے دفتر کھلتے چلے جاتے ہیں ۔نذیر قریشی کی خاصیت یہی ہے کہ وہ کسی بھی ادبی موضوع پر گھنٹے دو گھنٹے بنار کے تقریری کرنے پر قادر ہیں۔گرسائی جیسے چھوٹے سے مقام سے تعلق رکھنے والے نذیر قریشی کی تحریریں جہاں ان کے مطالعے کے شوق پر دال ہیں، وہیں یہ بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ اس چھوٹے سے مقام پر کس قدر ادبی سرگرمیاں اور اس کے فروغ کا ماحول بنا ہوا ہے۔مہنڈر سے کئی ایسی ادبی شخصیات اردو ادب پر روشن ستارے کی مانند ہیں اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوا چکی ہیں، منوا رہی ہیں اور منواتی رہیں گی۔نذیر قریشی سے زندگی اور سماج کا شائد ہی کوئی بڑا موضوع چھوٹا ہو۔شائد ہی کوئی ایسا بڑا خیال یا عمل ہو جو زندگی اور سماج کو متاثر کرتا ہو اور ان کی احاطہ تحریر سے بچ گیا ہو۔ان کا ایک بہترین مضمون ''جشن عید'' ہے۔جس میں انہوں نے اس سے پیدا ہونے والے شادمانی کے جذبات ،انسان کی زندگی میں اس کی اہمیت اور معاشرے کی بے راہ روی کے سبب اس کی خوشیوں تک رسائی نہ ہو پانے کی صورت میں ذہنی اذیت اور غم والم کی کیفیات کی جو عکاسی کی ہے، وہ ان کی نثر پر دسترس کا پتہ دیتی ہے۔''جشن عید'' کا آغاز اس کے انتظار کے متعلق دو شعروں سے ہوتا ہے۔

غرہ و شوال اے نور نگاہ روزہ دار

آکہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار

تیری پیشانی پہ تحریر پیام عید ہے

شام تیری کیا ہے، صبح عیش کی تمہید ہے

اس کے آگے عید کی مسرتوں، اس دن بننے والے لذیذ کھانوں اور خوشیوں کا تذکرہ ہے۔ ''لیکن اب کی بار'' کے جملے سے جو منظر بدلتا ہے، وہ یہ ہے۔

عید آئی ہے سلگتی ہوئی یادیں لیکر

آج پھر اپنی اداسی پہ ترس آیا ہے

اس کے آگے کی سطروں میں انہوں نے جس درد انگیزی کے ساتھ بے کسوں مجبوروں بالخصوص یتیم معصوم بچوں کا تذکرہ کیا ہے، وہ بہت متاثر کن ہے۔

''نگاہیں کسی کو ڈھونڈتی ہیں ،کھوئی کھوئی سی آنکھیں ،ڈوبتی نبضیں ،اکھڑتی سانسیں ،سلگتی آہیں ،چھلکتی آنکھیں، سراپا یاس۔اداس زبان، بے زبانی سے کہہ رہے ہیں

۔

پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے

ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے''

اس میں ''بے زبانی سے کہہ رہے ہیں'' اضطراب در اضطراب کی کیفیت پیدا کرتا ہے ۔یا تو یہ بے زبانی معصوم یتیموں کی ہوسکتی ہے یا پھر یتیموں جیسی زندگی گزارنے والے خستہ جاں افراد کی۔ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کا شعر یاد آتا ہے۔

ہونٹ سلے تھے ،سب لوگوں کے

میری آنکھ کے آنسو بولے

یہ آنکھ کے آنسو کہیں تو اپنی ناکردہ گناہوں کی سزا، اپنے گناہوں کی سزا، یا پھر تقدیر، یا پھر قدرتی آفات جسے نذیر قریشی ''قدرت کی کارستانی'' کہتے ہیں، جیسے مختلف اسباب کی بنیاد پر وجود میں آسکتے ہیں۔

ان مختصر سطروں میں ان کی بہترین نثر نگاری کے جلوے ملاحظہ ہوں۔

''نظام قدرت کی کارستانیاں دیکھئے کہ سال گزشتہ کی عید سے
آج تک اولاد آدم پر ہی کیا کیا گزری ہے۔ سمندر کا مزاج برہم
ہوا تو بپھری ہوئی لہروں نے سونامی نام پایا۔۔۔۔۔۔۔ ابھی
اس جانکاہ صدمے سے سنبھلے بھی نہ تھے کہ کشمیر کے زلزلہ نے
زمین ہی نہیں، دل بھی ہلا دئے۔۔۔۔۔۔۔ فرد سے سماج تک
اور پھر ملک وملت تک ایک عجیب صورت حال ہے کہ جس میں
دیوالی اور عید آئی ہے۔ اور دلی کا دل دہلانے والے دھماکوں کا
تحفہ لائی ہے۔''

لیکن جس طرح غم اور خوشی، اندھیرا اور اجالا، سکھ اور دکھ ایک سکے کے دو پہلو ہیں، اسی طرح مختلف النوا اور متصادم تلخ وشیریں حقیقتوں میں ایک اندرونی ربط ضرور ہوتا ہے، جو پہلو بدل بدل کر گردش کرتا رہتا ہے۔ اس آفاقی مرکزی حقیقت جس کے اندرون میں لاکھوں منسلک حقائق ہیں، کو تسلیم کرنے میں مذہبی افکار بے حد معاون ہیں، اسی لئے شائد نذیر قریشی نے دنیاوی درد و الم کا تذکرہ کرنے کے لئے موضوع کے طور پر اس دینی فریضے کا انتخاب کیا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اس متعلق لکھا ہے:

''یہ مختلف النوع اور متصادم حقیقتوں میں ایک اندرونی ربط کی
جستجو کا عمل بھی ہے۔ بیسویں صدی میں مشرق کی مذہبی فکر سے
والہانہ شیفتگی اور اس کی تجدید کا اصل سبب یہی ہے کہ مشرق میں
حقیقت یا مظاہر کے تمام درجات بنیادی حقیقت سے منسلک
تصور کئے گئے ہیں۔ چنانچہ کثافت کے بغیر لطافت کا جلوہ
سامنے نہیں آتا اور عالم کشف کے پست ترین درجات بھی

بالآخر اسی حقیقت اولیٰ سے ہم رشتہ ہو جاتے ہیں، جو مجسم خیرو

نور ہے۔"

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از۔ شمیم حنفی، ص،۹۶)

آخری سطروں میں نذیر حسین قریشی نے اس مضمون کا بہت عمدہ اختتام کیا ہے۔

"لیکن یہ نہ ہو سکا۔ سکھ کی سانسوں کا موسم نہیں۔ دل کی شادابی کی رت نہیں۔ روح کو چین نہیں

۔جی کو قرار نہیں۔ اس لئے:

کتنی پلکوں سے فضاؤں میں ستارے ٹوٹے

کتنے افسانوں کا عنوان بنا عید کا چاند

پھر بھی وجہ ہے انتظار کی کہ کوئی آئے گا، اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھی:

ہم گلے ملنے کی رسموں کا بھرم رکھ لیں گے

وہ نہ آئے، تو لپٹ جائیں گے دیواروں سے

مجبوریٔ حالات، افسردگیٔ جذبات کہ کلیجہ منھ کو آتا ہے، لیکن عید تو بہر حال عید

ہے، ہاں:

عید آزاداں شکوہ ملک و دین

عید مجبوراں ، ہجوم مومنین

نذیر حسین قریشی بلا شبہ اردو ادب کے ایسے نثر نگار ہیں جن پر خطۂ پیر پنچال کا فخر

کرنا مبالغہ نہیں ہے۔

خطۂ پیر پنچال میں
اردو زبان وادب کے فروغ میں
اہم کردار ادا کرنے والے
چند غیر مقامی ادباء و شعراء

نام : ڈاکٹر شمس کمال انجم تخلص : شمسؔ

ولدیت: مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم (فاضل دینیات، شاعر و ادیب)

تعلیم : بی اے (عربی زبان و ادب) مدینہ یونیورسٹی مدینہ منورہ (سعودی عرب)، ایم اے (عربی ادب) دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹریٹ (عربی) دہلی یونیورسٹی، فروری ۲۰۰۳ء

ملازمت: گیسٹ لیکچرر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی (۲۰۰۵ء سے ۲۰۰۶ء تک)، لیکچرر شعبۂ عربی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری جموں و کشمیر (۲۰۰۶ء سے ۲۰۰۹ء تک) ریڈر شعبۂ عربی بابا غلام شاہ بادشاہ یونورسٹی ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۲ء تک، اسوسی ایٹ پروفیسر ۲۰۱۲ء سے تا حال، صدر شعبۂ عربی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری ۲۰۰۹ء سے تا حال، بانی صدر شعبۂ اردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری جولائی ۲۰۱۷ء سے تا حال، بانی صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، جولائی ۲۰۱۷ء سے تا حال۔

باقاعدہ شاعری کا آغاز: ۲۰۰۰ء دوحہ قطر

ادبی سرگرمیاں: سکریٹری نشر و اشاعت انجمن شعرائے اردو ہند دوحہ قطر، فاؤنڈر ممبر انڈیا اردو سوسائٹی دوحہ قطر، بانی صدر انجمن شعرائے اردو راجوری، ممبر آل انڈیا اسوسی ایشن فار عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس نئی دہلی۔

اعزازات: ایوارڈ برائے ترجمہ (جدید عربی ادب) آتش اکادمی کڑپہ، تلنگانہ ☆ ممتاز محقق ایوارڈ برائے سال ۲۰۱۷ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری ۲۰۱۷ء۔

تالیفات و تراجم: عربی میں ★الطبقات الکبری لابن سعد دراسة تحلیلیة: المکتب الاسلامی، بیروت لبنان ۲۰۰۵م ★عبد اللہ بن المعتز وجھودہ فی علم البلاغة: مرکز الشیخ ابن حجر الدوحة قطر ۲۰۰۵م ★ظاھرة الحنین فی شعر المھجر ط ۱۹۹۹م نیو دلھی، ★بعیداً عن الوطن (تعریب مجموعة شعریة اردیة للشاعر حنیف ترین) ترین ببلیکیشنز ۲۰۰۶م، ★الکلمات العربیة فی اللغة الأردیة، دراسة وتحلیل، تحت الطبع (اردو میں) ★ بلاغت قرآن کریم (عربی سے ترجمہ) تالیف ڈاکٹر

فاضل سامرائی، فروری ۲۰۱۸ء☆ تاریخ ادب عربی (عربی سے ترجمہ) تالیف احمد امین، احمد اسکندری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی ۲۰۱۷ء★عربی تنقید کا سفر (عربی سے ترجمہ) تالیف طہٰ احمد ابراہیم۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی ۲۰۱۵ء، ★جدید عربی ادب (عربی سے ترجمہ) تالیف ڈاکٹر شوقی ضیف، اشاعت اول ۲۰۰۵، جدید ایڈیشن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی ۲۰۱۴ء★بلغ العلیٰ بکمالہ (نعتیہ مجموعہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی ۲۰۱۴ء★حدیث عرب وعجم (مضامین کا مجموعہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی ۲۰۱۳ء، عربی نثر کا فنی ارتقا (عربی سے ترجمہ) تالیف: ڈاکٹر شوقی ضیف، الکتاب انٹرنیشنل، مرادی روڈ جامعہ نگرنئی دہلی ۲۰۱۲ء★منظر وپس منظر (بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی پروفائل کا انگریزی سے ترجمہ) یونیورسٹی پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء★جدید عربی شاعری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی، ۲۰۰۸ء★تاریخ مدینہ منورہ (عربی سے ترجمہ) تالیف غالی محمد الامین **الشنقیطی**، دارالاشاعت مصطفائی، لال کنواں دہلی، ۲۰۰۸ء ★ نقوش جاوداں، تذکرہ مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم، تخلیق کار پبلشر، لکشمی نگرنئی دہلی، ۲۰۰۸ء ★ فضائل اعمال بخاری ومسلم کی احادیث کی روشنی میں، دالاشاعت مصطفائی، لال کنواں، دہلی، ۲۰۰۷ء☆ نیکی کمانے کے آسان طریقے (احادیث کا ترجمہ وتخریج) المعہد الاسلامی ہریانہ ۲۰۰۵ء★امام ناصرالدین البانی کے حالات زندگی (عربی سے ترجمہ) تالیف ابواسماء عطیہ المصری، ندوۃ السنۃ اٹوا بازار سدھارتھ نگر یوپی ۲۰۰۰ء★حرف آخر (حماد انجم ایڈوکیٹ مرحوم کی علمی وادبی تحریروں کا مجموعہ) زیر اشاعت ☆ کلیات انجم (مولانا حامد الانصاری انجم کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ شعری مجموعوں کا مجموعہ) زیر اشاعت ★لولوئے لالہ (غزلوں کا مجموعہ) زیر ترتیب۔ عربی اور اردو میں تقریباً سو مضامین، تبصرے شائع شدہ۔

پتہ: Dept.Of Arabic Baba Ghulam Shah Badshah University Rajouri

موبائل: 9086180380

ڈاکٹر شمس کمال انجم

ڈاکٹر شمس کمال انجم کی اردو ادب کی خدمت کا دائرہ بہت وسیع ہے، انہوں نے ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے، اور اپنے جس تخلیقی زاوئے سے انہوں نے گفتگو کی ہے، اس میں معتبر ٹھہرے ہیں۔ اس کا ثبوت معیاری اہل علم اور اہل ادب کے ان کی کتابوں پر لکھے گئے مضامین ہیں، جو ان کی قدر و منزلت کے ضامن ہیں۔ مثال کے طور پر پروفیسر قدوس جاوید نے ان کی کتاب ''حدیث عرب وعجم'' پر جو مضمون لکھا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''چار ابواب پر مشتمل اس تصنیف میں تحقیقی وتنقیدی اور تاثراتی نوعیت کی تحریریں شامل ہیں۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم نے عربی زبان و ادب، شاعروں اور دانشوروں کے علاوہ قرآن پاک، احادیث اور بعض ایمانی و ایقانی مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ اور چونکہ شمس کمال انجم عربی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہیں، اس لئے قرآن پاک جیسے زندہ معجزے کے مطالعہ، تجوید اور تفسیر کی گہرائیوں کی جانب بڑھتی ہوئی ان کی تخلیقیت، ذوق تحقیق اور تنقیدی بصیرت کے پاؤں میں قابل ستائش ثابت قدمی بھی توجہ کھینچتی ہے۔ عربی کے شاعروں اور دانشوروں مثلاً ابن زیدون، طٰہٰ حسین، علامہ سیوتی، پروفیسر محمد سلیمان اشرف اور پروفیسر فرحانہ طیب صدیقی وغیرہ ان کی تحریروں میں پڑھ کر خواہش ہوتی ہے کہ تجزیہ وتحلیل کے ان روشن چراغوں کا سلسلہ ذرا اور طویل ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ شمس کمال انجم نے اردو شاعروں میں میر تقی میر، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کی شاعری کے لسانی وفکری جہات اور فنی وجمالیاتی امکانات پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، ان سب کا سروکار کسی نہ کسی صورت میں انسانی زندگی سے ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو کہ ہر میدان عمل میں سرگرم ہے اور جس کے سبب کائنات کی رونق ہے، اور جس کی ہدایت کے لئے مقدس کتابیں اتاری گئیں اور اس کے ذہن کو اتنا کشادہ کیا گیا کہ وہ ادب اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ اور اسی ردوقبول کے ساتھ زمانہ اپنے اختتام کو پہنچے گا۔ لیکن اس دن کے آنے تک ایسی متعدد شخصیات دنیا میں آتی رہیں گی، جن سے انسانی فلاح و بہبود کا کام لیا جاتا رہے گا۔ ادبی سطح پر مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ایسے ہی مرد آہن کی ہے، جنہوں نے اپنے ارادوں اور مقاصد کی حصول یابی سے ملک وملت کو فیض پہنچایا ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش جس پر زیادہ تر اہل ادب کا اتفاق ہے شمس کمال انجم کی تحقیقی بصیرت اس متعلق ایک نیا زاویہ رکھتی ہے۔ اپنے مضمون ''مولانا ابوالکلام آزاد۔۔تاریخ پیدائش کا علمی محاکمہ'' میں رقم طراز ہیں۔

''آپ کا عیسوی سال ولادت ۱۹۸۸ء اور ہجری ماہ و سال ولادت ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ ہے۔ تاریخی نام ''فیروز بخت'' اور فارسی مصرعے ''جواں بخت و جواں طالع، جواں باد'' سے بھی سال ولادت ۱۳۰۵ھ نکلتا ہے۔ مولانا نے یہاں عربی سال اور مہینے کا ذکر کیا ہے، مگر تاریخ اور دن کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح انہوں نے عیسوی سال کا تو ذکر کیا، مگر تاریخ اور مہینے کے ذکر سے اعراض کیا۔''

شمس کمال انجم نے اس مضمون میں جو دلائل پیش کئے ہیں، وہ بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح وہ جس بھی صنف میں اظہار خیال کرتے ہیں، اس میں اپنی بات اتنے مستحکم طریقے سے رکھتے ہیں کہ علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور مضمون کے اعتبار سے یہاں بھی ان کا اپنا مخصوص زاویہ نگاہ نظر آتا ہے۔ ان کا ایک افسانہ جس کا عنوان فیشن ہے، اس میں ایسے موضوع کو اٹھایا گیا ہے جو آجکل ہر مقدس مقام پر تقریباً عام ہو گیا ہے، لیکن اس پر اب تک کوئی افسانہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔ آپ کتنے خوش نصیب ہیں کہ آپ کو

اس دیار پاک میں کام کرنے ،روزی، روٹی کمانے اور زندگی
کے خوبصورت ایام گزارنے کا موقع ملا۔آپ تو جانتے ہیں
،لوگ کئی لاکھ روپئے خرچ کر کے حج وعمرہ کے لئے جاتے
ہیں ۔میں فیس بک پر آپ کی سرگرمیوں کو دیکھ کر اکثر سوچتا
ہوں ،اکرم صاحب تو ہیں بھلے آدمی۔خوش خصال بھی
ہیں۔دینی مزاج کے حامل بھی ہیں۔انہیں حرم پاک میں رہنے
کا موقع تو ملا ہے،مگر وہ ہیں کہ سارا وقت فیس بک پر صرف کر
رہے ہیں۔فیس بک تو میں جانتا ہوں۔آپ یہ بتائیں کہ واٹس
اپ کے کتنے گروپوں میں شامل ہیں ۔وہاں بھی آپ اچھا
خاصہ وقت صرف کرتے ہوں گے۔روزانہ پچیس پچاس میسج تو
لکھتے اور بھیجتے ہوں گے۔ارے جناب اس وقت کو غنیمت سمجھئے
اور حرم پاک میں رہائش کو مغفرت کا ذریعہ بنایئے۔ٹائم ملے تو
جناب طواف کیجئے۔ایسی عبادت دنیا میں اور کہیں نہیں ملے
گی۔مزید وقت ملے تو دو دو رکعت نفلیں پڑھئے ۔ایک نماز کا
ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔آپ جانتے ہیں نا۔
جی۔جی حضرت! آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔میں نے تو کبھی
سوچا ہی نہیں کہ میں فیس بک پر کتنا وقت ضائع کرتا
ہوں۔واٹس اپ پر کتنا ٹائم فضولیات کے میسج دیکھنے اور پڑھنے
میں لگاتا ہوں ۔اگر یہی وقت حرم پاک میں عبادت ،تلاوت
،ذکر واذکار اور طواف کعبہ میں لگاؤں تو کیسے میرا عقبیٰ سدھر سکتا
ہے۔"

اس افسانے کی خصوصیت یہ ہے کہ سیدھے سادے الفاظ اور اسلوب میں اس قدر توجہ انگیز مسئلے کو بیان کر دیا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دوسرے کردار کو بہ آسانی یہ اعتراف بھی کروا دیا گیا کہ وہ کس قدر غفلت میں تھا ،ورنہ زیادہ تر افسانوں کا کلائمکس یا پھر احتجاج یا پھر چند ایک

انوکھے واقعات کے بروئے کار آنے کے بعد ہی کردار اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہے، اس پر نادم ہوتا ہے۔ شمس کمال انجم کی غزلوں میں بھی زیادہ تر نصیحت آمیز گفتگو کی گئی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

حرف آخر گر چہ ہے لکھا ہوا تقدیر کا
معجزہ بھی رنگ لاتا ہے بہت تدبیر کا

یہاں اقبال کا شعر یاد آتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی ،جہنم بھی
یہ خاکی ،اپنی فطرت میں نہ نوری ہے ،نہ ناری
ہے

اس پر غور کرتے ہوئے پرانی فلم کا ایک گیت بھی یاد آتا ہے جو غالباً اقبال کے اسی شعر سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہوگا۔

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے
اپنے پہ بھروسا ہے تو اک داؤں لگا لے

یہ تصویر کا ایک رخ ہے یا پھر اسے ایک نظریہ کہ سکتے ہیں۔ اقبال کے شعر کا جہاں تک سوال ہے تو ان کے لئے آخرت کے سامنے دنیاوی زندگی ہیچ تھی اور ان کا زیادہ تر کلام اسی مرنے کے بعد کبھی نہ ختم ہونے والی دنیا کی زندگی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ تو ایک دوسرا تصور یہ بھی ہے کہ تدبیر بھی تقدیر یہ کی طابع ہے، اگر تقدیر ہوگی تو تدبیر کام کرے گی۔ دلیپ مکمار اور شمی کپور کے اوپر شوٹ کیا گیا پرانی فلم ''ودھاتا'' کے ایک گیت کے دو مصرعوں جس میں ایک میں تقدیر اور دوسرے میں تدبیر کا بیان ہے، اسے یہاں پیش کرنا خالی از دلچسپ نہ ہوگا۔

ہاتھوں کی چند لکیروں کا۔۔۔۔۔۔۔۔یہ کھیل ہے سب تقدیروں کا
تقدیر ہے کیا ،میں کیا جانوں ۔۔۔میں عاشق ہوں تدبیروں کا

لیکن آج کے دور کا اور اگر تاریخ کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو تقدیر ہی تدبیر نکالنے کا سبب بھی رہی ہے، اگر تقدیر نہ ہو تو ساری تدبیرین بھی الٹی پڑ جاتی ہیں۔ ممکن ہے اس کا اطلاق ہر کسی پر نہ ہو لیکن یہ بھی ایک ایسی تلخ حقیقت ہے، جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شمس کمال انجم نے معاشرتی برائیوں اور ان کے اسباب جو کہ ظاہر ہے حضرت انسان کے ہی عطا کردہ

ہیں، کی جانب اپنے اسلوب میں توجہ دلائی ہے۔

چہرے وہی، لباس وہی ،شخصیت وہی
پر اپنے قول وفعل سے بدلے ہوئے ہیں ہم

ایک شعر جو کہ قوم مسلم پر صادق آتا ہے، یہ ہے۔

کچھ سوچتے نہیں ہیں کسی مسئلے پہ اب
جذباتیت کے بحر میں ڈوبے ہوئے ہیں ہم

تہذیبی اقدار کی پست حالی اور دوسرے مسائل کی جانب توجہ دلاتے ہوئے ان کے یہ اشعار بہت اثر رکھتے ہیں۔

شعور مر گیا، جذبوں میں تازگی نہ رہی
حیات لٹ گئی، جب فکر وآگہی نہ رہی

میں مبتلائے درد محبت بھی کیا ہوا
مدت سے میری روح پھنسی ہے عذاب میں

فتنہ پردازی، حسد،نفرت،عداوت اور غرور
ان سے بڑھ کر آج کی دنیا میں بلوائی نہیں

شمس کمال انجم انسانیت کی خودروحالت کا تجزیہ کرتے ہیں، اور یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ان ذہنی اور جذباتی مسائل کے وجود سے ایک بڑا طبقہ جسے حکمران یا اہل ثروت اور دوسرا وہ مفلس اور دبا کچلا طبقہ جسے روٹی کے علاوہ دوسری جانب توجہ دینے کی ضرورت سے ہی ایک طرح سے انکار ہے، اتنی حسیت رکھنے کے باوجود ان سے صرف نظر کیوں کر رہا ہے، جب کہ وہ بھی کسی نہ کسی صورت اس کی زد میں ضرور ہے۔ سماج اور معاشرے کے دینی ودنیاوی مسائل پر یہی گرفت ڈاکٹر شمس کمال انجم کے سنجیدہ اور اعلیٰ تخلیقی ذہن کی ضمانت ہے۔

نام: ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ولدیت: محمد اسداللہ وانی

پیدائش: ۳، مارچ ۱۹۶۰ء ڈوڈہ

تعلیم: پی۔ ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

پیشہ: اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)

تصانیف: ہزاروں غم، میٹھا زہر، (افسانوی مجموعے)
تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران (تحقیق)
اردو ادب میں تانیثیت (تحقیق)
آئینہ در آئینہ، شعور بصیرت، اعتبار و معیار (مضامین)
خارستان کا مسافر (سوانح)

پتہ: Dept.of Urdu Baba Ghulam Shah Badshah University Rajouri

موبائل: 9419336120

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے اردو ادب کی جن اصناف پر بھی زور قلم صرف کیا ہے، وہاں اپنی ذہنیت کے گوہر لٹائے ہیں۔ان کا خاص میدان نثر نگاری ہے۔ وہ ایک بہترین افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری کے میدان میں بھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔اردو ادب کے آج کے غالب موضوعات جن میں تانثیت بہت اہم ہے، پر ان کی ۲۸۰ صفحات پر مشتمل کتاب بہ عنوان ''اردو ادب میں تانثیت'' شایع ہو کر داد و تحسین وصول کر چکی ہے۔ان کے مضامین کا مجموعہ ''اعتبار و معیار'' ہے جس میں بہت اہم مضامین ہیں۔ایک مضمون بہ عنوان ''اردو ناولوں میں سیکولرزم اور قومی یکجہتی کے عناصر'' ہے۔اس کا ابتدائی پیراگراف یہ ہے۔

> ''سیکولرزم، مغربی اصطلاح ہے، جس کے معنی و مفہوم میں ایک ایسا معاشرتی اور تعلیمی نظام شامل ہے، جس کی بنیاد مذہب کے بدلے سائنس پر رکھی گئی ہے۔اور جس میں مذہب کا کوئی بھی عمل دخل نہیں ہے۔مزید یہ کہ سیکولرزم کا پہلا کلیہ فرد کی آزادی ہے ،یعنی ہر شخص کو اپنے طریقے پر سوچنے کا حق حاصل ہے۔تمام فکری امور میں اسے اختلاف رائے کا بھی حق حاصل ہے۔سیکولرزم نہ صرف ایک شخص کو فکری آزادی اور اختلاف رائے کا حق دیتا ہے، بلکہ وہ تو اسے خدا اور روح کے بارے میں بھی مباحث کی راہیں فراہم کرتا ہے، گویا سیکولرزم اس بات پر زور دیتا ہے کہ فکر و ضمیر کی آواز کو بلند کرنا اور آزادانہ رائے قائم کرنا ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔''

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ سیکولرزم سبھی مذاہب کو رد کرتا ہے، کیوں کہ وہ خود آدمی کو آزاد چھوڑتا ہے کہ وہ اچھائی کے لئے اور امن وسکون کے لئے راہیں تلاش کرے گا تو

اچھا کہلائے گا، اوراس بات کو تو بڑے سے بڑا لا مذہب بھی مانے گا کہ مذہب کی اصل قدروں میں امن ہی امن ہے، آزادی ہی آزادی ہے اور سکون ہی سکون ہے۔ اس طرح غور کیا جائے تو سیکولرزم تمام مذاہب جو کہ قرآن کے مطابق اپنی اصل میں ایک ہی ہیں، ان میں ملاوٹ کر کے بہت سی لا مذہبیت ڈال کر الگ الگ مذاہب کی شکل دے دی گئی ہے، پر نظر کی جائے تو سیکولرزم کا اصل معنی و مفہوم اصل مذہبی قدروں میں ہی پوشیدہ ہے۔ چونکہ ہر آدمی اپنے نقطہ نظر کا مالک ہے، اس لئے اس مثبت قدر کو دیکھنے اور سمجھنے کا انداز بھی الگ الگ ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے بہت عمدہ لکھا ہے۔

> ''نئی مذہبیت عصر حاضر کی تہذیب کے زخموں کا مرہم ہے۔ یہ منظم مذاہب کی طرح خواب نامے نہیں مرتب کرتی، بلکہ تعبیر کی تلخیوں کو کم کرتی ہے اور ناکامیوں سے کام لینے کا ہنر سکھاتی ہے۔ عقلیت کے افسانہ و افسوں کی شکست سے پیدا شدہ احساس لاحاصلی کے بار کو کم کرتی ہے۔ جدید تہذیب کے دور اولین میں لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ سائنس ایک نجات دہندہ ہے جو انسان کو مذہبی توہمات اور معاشرتی بدحالی کی گرفت سے آزاد کر کے اسے فطرت کا مالک و مختار بنا دے گی۔ دنیا اس کے لئے دارالامان ہوگی اور اس کی مملکت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ مظاہر پر انسان کی گرفت جتنی مضبوط ہوتی گئی، اپنے وجود پر اس کا تسلط اتنا ہی کمزور ہوتا گیا اور مروجہ اقدار و معیار کے سیلاب میں وجود کے مرکزی نقطے سے وہ رفتہ رفتہ دور ہٹتا گیا۔''

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از۔ شمیم حنفی، ص، ۱۰۹)

''تانیثیت'' کی اصطلاح جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اردو ادب میں کم از کم مابعد جدیدیت کی دین ہے، اس سے قبل کیا، جب سے عورت کا شعور بیدار ہوا ہے، تب سے دنیا کی تمام اعلیٰ پائے کے زبان و ادب میں ان کے اپنے او پر مظالم کے خلاف احتجاج کا ایک سلسلہ

موجود ہے۔اردو ادب میں بھی اس موضوع اور اس سے انسلاک سے متعلق وافر تعداد میں مواد موجود ہے لیکن اس سے قبل کوئی خاص نام یا اسے ایک موضوعاتی رجحان کے طور پر مابعد جدیدیت سے پہلے برتنے کے دلائل نہیں ملتے۔مشتاق احمد وانی نے اپنے مضمون ''اردو فکشن میں تانثیت'' میں اس کے مفہوم و معانی پر فکری گفتگو کی ہے۔چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

> ''تانثیت'' دراصل ایک جدید اصطلاح ہے،جس کی صراحت میں کئی پیچیدگیاں اور الجھنیں حائل ہیں۔اس لحاظ سے اس کی ایک جامع تشریح ممکن نہیں۔البتہ یہ ایک الگ بات ہے کہ مغربی ممالک میں تانیثی ادب کو تحقیقی و تنقیدی تناظر میں دیکھا جا چکا ہے اور اس کے روشن امکانات واضح ہو رہے ہیں ----------------تانیثیت کے افہام و تفہیم میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ جب ہم تانیثیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد عورتوں کی اس تحریک سے ہے،جس میں خواتین رہنماؤں نے مردوں کی بالا دستی اور اپنی محکومیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔جس میں عورتوں کے حقوق ،نابالغ بچوں کی پرورش کے حقوق ،جائداد میں معقول حصہ ،طلاق کے مسائل کی وضاحت،مختلف تعلیمی شعبوں میں عورتوں کی شمولیت،مردوں کے یکساں اجرت کا تقاضا اور ووٹ کا حق جیسے مطالبات شامل تھے۔عورت چونکہ علم کے زیور سے محروم رکھی گئی تھی،اس لئے اسے اپنے مقام کو پہچاننے اور عقل و شعور کی منزلیں طے کرنے میں کافی وقت لگا۔مردانہ سماج میں عورت کی جو شبیہ بن چکی تھی،وہ سوائے جنس لطیف،صنف نازک،محبوبہ اور طوائف کے اور کچھ نہ تھی۔اس پر مستزاد یہ کہ مرد کی نظر میں عورت ناقص العقل اور مجہول ٹھہر چکی تھی۔

ظاہر ہے کہ عورتوں کے اس احتجاج کے پیچھے صدیوں کا استحصالی خوف اور اس کے نتیجے

میں دردمندی اور غم کا ایک لاوا ہے جو اس قسم کی تحریروں میں پھوٹ پڑتا ہے۔ یہ خوف اور درد مندی جب فن پارے میں ڈھلتی ہے تو اس کا اثر ایک زمانے پر ہوتا ہے اور ایک زمانے تک رہتا ہے۔ ارسطو نے اس متعلق بہت کارآمد باتیں کہی ہیں۔

> ''خوف اور دردمندی کے جذبات کو برانگیخت کرنے کا کام سینری سے بھی لیا جا سکتا ہے، لیکن یہ فن پارے کے داخلی ڈھانچے سے بھی نمودار ہو سکتے ہیں۔ یہی طریقہ بہتر ہے اور برتر شاعر (فنکار) کی نشاندہی کرتا ہے، کیوں کہ پلاٹ کو اس طرح تعمیر ہونا چاہئے کہ آنکھ کی مدد کے بغیر اسے صرف سن کر انسان خوف سے تھرا اٹھے اور اس کا دل دردمندی سے پگھل جائے۔''

(خوف اور دردمندی، از۔ شعریات، ترجمہ وتعارف، شمس الرحمن فاروقی، ص ۸۴)

مشتاق احمد وانی کا ایک اہم مضمون بہ عنوان ''علامہ اقبال کی مغربی طرز حیات سے بیزاری'' ہے ، جس میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب ،فساد قلب ونظر کی پروردہ ہے جو حسن وصداقت اور بلند خیالی و پاک ضمیری سے عاری ہے ۔ وہ مغرب کے شعبدہ بازوں کو ابلیس کے سیاسی فرزندوں کا نام دیتے ہیں کہ جن کے اذہان پر یہ فکر سوار ہے کہ مشرق سے کس طرح اس کی روح چھین لی جائے۔ مزید یہ کہ اہل مشرق کی روحانی قوت کو اس طرح سلب کیا جائے کہ ایشیا اور افریقہ کے نو آموز ممالک ایک بار پھر مغرب کی غلامی میں آجائیں۔''

ظاہر ہے کہ یہ مغربی تہذیب کے نام پر مغربی تہذیب کی وہ بگڑی ہوئی شکل ہے، جس نے اصل مغربی قدروں کو پست کر کے ان کی جگہ خود کو مسلط کر دیا ہے، ورنہ اگر یہ اپنی اصل میں اتنی ہی بگڑی ہوئی ہوتی تو مغرب میں اتنے بڑے بڑے شاعر و دانشور، فلسفی کہاں ہو سکتے تھے۔ اور اگر آج بھی وہاں کے معاشرے کا جائزہ لیا جائے تو اپنے ملک کے لوگوں کے لئے ظلم نام کی کوئی چیز ان کے دلوں میں نہیں ہے، جو بھی فساد قلب ونظر ہے، وہ غیر ملکوں کے لئے ہے۔ اس طرح یہ

مفروضہ کہ ''ظالم ہر حال میں بہر حال ظالم ہی ہوتا ہے'' خطرے میں آ جاتا ہے۔ بہر حال جہاں اقبال مغربی تہذیب کی اس بگڑی ہوئی شکل سے بیزار تھے، اسی طرح وہاں کے بڑے ذہن والے اہل علم و دانش بھی مغربی تہذیب کے نام پر ہو رہے اس ظلم کے خلاف سب سے پہلے احتجاج میں پیش پیش رہے، اس کا ثبوت وہاں پر برپا ہوئیں مختلف قسم کی تحریکیں ہیں، جو انسان کی فلاح و بہبود کے لئے وجود میں آئیں۔ اور پھر خود اقبال کئی مغربی دانشوروں سے متاثر رہے۔ جس میں سے نطشے کا ذکر کرتے ہوئے مشتاق وانی لکھتے ہیں۔

> ''اقبال کی نظر میں نطشے کا فوق البشر نظریہ بہت حد تک ان کے مرد مومن سے مماثلت رکھتا ہے، مگر اس کے باوجود اقبال نطشے کے تخلیقی کردار میں روحانیت اور عشق سوز اں کی رمق نہیں پاتے ،اسی بنیاد پر اسے مجذوب فرنگی کا نام دیتے ہیں کہ جس نے مقام کبریائی پر کبھی غور وتدبر نہیں کیا۔''

لیکن مغربی شعرا و دانشوروں کی ایک بڑی تعداد ہے جو مقام کبریائی کے تعلق سے مذہبی نقطہ نظر رکھتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ مذہب اسلام سے ان کا رشتہ نہیں ہے لیکن انجیل مقدس اور دوسری کتب سے تو ہے اور اس کا انہوں نے کئی بار انکشاف بھی کیا ہے۔ ملٹن کا یہ کہنا کہ سب کو ایسائی ادب پڑھنا چاہئے ،بھی دلیل ہے۔ مشتاق وانی کی اس مغرب سے بیزاری کا مطلب وہی مغرب کی تہذیب سے عاری طرز حیات ہے، جس میں مغرب ڈوبا ہوا ہے اور جسے انہوں نے اپنے عیش اور اس کے حصول کے لئے دوسروں پر ظلم کو رائج رکھنے اور اسے ہر حالت میں درست ثابت کرنے کے لئے اوڑھ رکھا ہے۔ جس کی ایک بڑی اہم دلیل پروفیسر شمیم حنفی نے پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

> ''فطری انتخاب کے تصور میں عام انسانی معاملات سے متعلق بعض پالیسیوں کے بہانے ڈھونڈے گئے، مثلاً وکٹوریائی عہد کے انگلستان میں اقتصادیات اور تجارت میں آزاد مقابلے کی پالیسی یا انیسویں صدی کے اواخر میں فوج کی آمریت اور جسمانی طاقت پر ایمان ، جسے فرانس اور جرمنی کی جنگ

(1870ء) میں جرمنی کی فتح کے بعد مطلقیت کے ادبی مسلک کی حمایت بھی حاصل ہوئی اور ادیبوں کا ایک طبقہ سیاسی مقاصد اور مفادات کا علمبر دار بھی بن گیا۔ اس حمایت کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ سیاست اقوام میں جنگ در اصل فطری انتخاب اور بقائے اصلح کے سائنسی نظرئے کا ہی عملی اظہار ہے اور یہ کہ جنگ کے بغیر انسان کی قوتیں پژمردہ اور قومی ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ حوصلوں کو جلا نہیں ملتی اور انسان اپنی شخصیت کا صحیح انکشاف نہیں کر پاتا، یعنی جنگ کا جذبہ انسان کے خمیر میں شامل ہے۔

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از۔ شمیم حنفی، ص ۸۱)

مشتاق احمد وانی ریاست جموں وکشمیر کی شائد اب تک کی واحد شخصیت ہیں جن کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ڈی لٹ کی سند سے نوازا گیا ہے۔ دعا ہے کہ ان کا فن ترقی کی نئی نئی منزلوں کو سر کرتا رہے۔

خطہ پیر پنچال۔۔۔۔۔علاقائی زبان وادب

خطہ پیر پنچال کے باشندوں نے اپنی علاقائی زبانوں کی جانب بھی جو توجہ کی ہے، اس کی نذیر بھی مشکل سے ہی ملے گی۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ بڑی زبان کے سائے تلے چھوٹی یا علاقائی زبانیں تخلیقی سطح پر پنپ نہیں پاتیں اور محض بول چال تک ہی محدود رہ جاتی ہیں، لیکن قربان جایئے یہاں کے حساس ذہنوں پر کہ انہوں نے ڑی زبانوں مثلاً انگریزی، اردو، عربی وغیرہ کے فروغ کے ساتھ ساتھ جو دو خاص علاقائی زبانیں یہاں عام بول میں استعمال ہوتی ہیں، وہ پہاڑی اور گوجری ہیں۔ ان کے علاوہ ڈوگری جو کہ جموں ریجن کے تینوں خطوں (خطہ پیر پنچال، چناب اور جموں) کی رابطے کی زبان ہے، اپنی اصل کے لحاظ سے اس کا زیادہ تر تعلق خطہ جموں سے ہے، گو کہ اس کو پورے جموں ریجن کے لوگ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی زبان ہے جو کہ ڈوگری زبان سے کافی قریب ہے اور ہر ڈوگری سمجھنے والا پنجابی بھی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

خطہ پیر پنچال میں پہاڑی اور گوجری زبانوں نے خاص طور پر بہت تخلیقی ترقی کی۔ ان دونوں زبانوں میں یہاں وافر تعداد میں مواد موجود ہے، اور اس علاقے کے ادباء وشعراء نیان دونوں زبانوں میں اپنی تاریخ بھی مرتب کی ہیں، جن سے ان کی اپنی علاقائی زبانوں سے محبت اور حساسیت کا پتہ چلتا ہے۔ پہاڑی زبان کے تعلق سے یہاں کے نامور محقق ایم۔ این۔ قریشی لکھتے ہیں۔

> ''مسٹر بین نے پہاڑی زبان کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (الف) مشرقی پہاڑی، جس کا علاقہ نیپال اور گورکھپور بتایا ہے (ب) مرکزی پہاڑی، جس کا علاقہ گڑھوال اور دہریدون بتایا ہے، اور (ج) مغربی پہاڑی، جس کا تعلق ہماری زیر بحث پہاڑی سے ہے۔ اس تقسیم کے مطابق مشرقی پہاڑی سے مراد موجودہ نیپالی زبان ہے، مرکزی پہاڑی سے مراد گڑھوالی اور

کمایونی ہے جواتر پردیش (اب اترا کھنڈ) کے پہاڑی خطوں
میں بولی جاتی ہے، جب کہ پہاڑی زبان کی نہایت اہم اور
واضح سکل مغربی پہاڑی ہے، جو ہماچل پردیش کے مغربی
حصوں کلو، کانگڑہ، چمبااور ریاست جموں و کشمیر کے اضلاع
کٹھوعہ، جموں، اودھم پور، ڈوڈہ، راجوری، میر
پور، پونچھ، مظفر آباد، بارہمولہ، سرینگر، اننت ناگمیں بولی جاتی
ہے۔اس کے علاوہ کوہ مری، وادی کاغان، ہزارہ اوردریائے
سندھ کے مشرقی کناروں پر بھی یہ زبان کثرت سے بولی جاتی
ہے۔اس کے ساتھ ہیدریائے سندھ کے مغربی علاقے
پشار، ڈیرہ غازی خان اور بنو میں بھی ہاڑی زبان بولی جاتی
ہے، جہاں اس کو ''ڈیروی'' کہا جاتا ہے۔''ہنکو'' ہو یا
''ہندکو'' اور ''پھٹواری'' یہ سب پہاڑی کے ہی روپ
ہیں۔ پہاڑی کوئی نئی زبان نہیں بلکہ صدیوں پرانی زبان
ہے، جس نے آریوں کی آمد اور پہاڑوں میں آباد ہونے سے
لے کر آج تک مختلف ارتقائی منازل طئے کئے ہیں''
(ادبیات پونچھ، ترتیب۔محمد ایوب شبنم ،ص،۹۸،۹۷)

پہاڑی ادب میں یوں تو شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے، جن میں سے چند نام صابر مرزا، شباب مرزا، شکیل احمد مرزا شاکر، محمد حسین صادق، عبدالکریم رحمتی، دیویندر سودن، شری دیو شرما، شیخ ظہور احمد، مسعود الحسن مسعود، طاہر محمود، شیخ آزاد احمد آزاد، وید پرکاش راہی، خوشدیو مینی، شیخ عبد الصمد شوق، سوامی انتریامی، اقبال شال، اقبال نازش، جاوید خان، سید حاکم شاہ قمر، سائیں قادر بخش، خورشید بسمل اور نثار راہی خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ چونکہ اس مختصر مضمون میں ان تمام پر مفصل گفتگو نہیں کی جاسکتی، لہذا چند ایک کے مختصر ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔

نثار راہی خطہ پیر پنچال کے ایسے تخلیق کار ہیں، جنھوں نیہاں کی تقریباً ساری ہی علاقائی زبانوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ پہاڑی سے انہیں خاص لگاؤ ہے، اور اردو شاعری میں بھی

انہوں نے طبع آزمائی کی ہے، ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اپنے بعض پہاڑی اشعار کو انہوں نے اردو اشعار میں مع ردیف وقافیہ کے ترجمہ کیا ہے۔ اس قسم کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔

دل کی دھڑکن بڑھ چلی ہے دیکھنا
اضطراب و بے کلی ہے، دیکھنا

منتشر ہیں سوچ کے سب زاوئے
دور تک کیوں کھلبلی ہے، دیکھنا

کہیں بھونچال آتے ہیں، کہیں لاوے نکلتے ہیں
مرا باہر سلامت ہے، مرا اندر نہیں دیکھا

جھیل میں ڈالے کنکر کس نے
اس پر کھولے دفتر کس نے

اس قسم کے اشعار نثار راہی کی ادبی کاوشوں کو اعتبار بخشتے ہیں۔ انہوں نے زمانے کے سرد وگرم کا جو مشاہدہ کیا ہے، اس کا نچوڑ ان کی شاعری میں بخوبی نظر آتا ہے۔ جس انہماک سے وہ اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں، قوی امید ہے کہ ان کے قلم سے اس قسم کے ہی بہترین اشعار نکلیں گے اور کشت پہاڑی ادب کی آبیاری کرتے رہیں گے۔

طاہر محمود کے دو پہاڑی اشعار اور ان کا اردو ترجمہ جو کہ اشعار کے مفہوم کو واضح کرتا ہے، خدمت میں حاضر ہے۔

مکی گئے ارمان بڑے سن
رستے بچ طوفان بڑے سن
تہرتی اپروں اکو دسیا
ادیاں تہ آسمان بڑے سن

اردو ترجمہ:

بہت سارے ارمان تھے، مگر سب مٹ گئے
راستے میں بڑے طوفان آئے ،مٹ گئے
دھرتی پہ کھڑے ہو کر دیکھا تو ایک تھا
اور جب رونے لگا تو کئی آسمان نظر آئے

شیخ آزاد احمد آزاد کے بھی دو پہاڑی اشعار اوران کے اردو ترجمے پیش ہیں۔

راز عشق نا جان سکن دارو کول آگ بالن لوک
پھل سٹ پیراں ہیٹھ لتاڑن کنڈھے جن سہالن لوک
باہروں چٹے دراں تھوتے ،اندروں کالے ناگ درندے
کنہڈی گالا کھلم کھلا جو لھے سوٹھالن لوک

اردو ترجمہ:

عشق کے راز کو نہیں سمجھ سکے تو ایسا ہے، جیسے بارود کے ڈھیر کے پاس کوئی آگ جلاتا ہے
لوگ پھولوں کو پاؤں کے نیچے دباتے ہیں، اور کانٹوں کو اٹھا کر سنبھالتے ہیں
سامنے سفید دل کے بہت قدرداں ہوتے ہیں، مگران کا داخل کالے ناگوں کی طرح ہوتا ہے
ایسے لالچی لوگ کہ انہیں کچھ بھی نگلنے میں عار نہیں ہوتی، جو ملتا ہے، کھا جاتے ہیں

محمد اقبال شال کے دو پہاڑی اشعار کے بھی اردو ترجمے دیکھ لئے جائیں۔

کسی نے تو محبوب کی چٹھی کو تعویز بنا کر گلے میں ڈالا
اور اسی چاہت کے ساتھ وہ زندگی گزار گیا
تمہاری یاد ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہوں
حتیٰ کہ میں تیری شان میں گیت گا گا کر تھک چکا ہوں

گوجری ادب کے حوالے سے ڈاکٹر رفیق انجم کی کتاب ''گوجری ادب کی سنہری تاریخ'' کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہاں کے یہاں کے باشندے اپنی علاقائی زبانوں کو کس قدر عزت دیتے ہیں اور انہیں ادبی اور تخلیقی سطح پر محفوظ رکھنے کا ان کے اندر کس قدر زبردست رجحان

ہے۔ڈاکٹر رفیق انجم نے اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

''زبانوں کے محققین نے لکھا ہے کہ برصغیر میں داخل ہونے سے پہلے آریا اقوام انڈک زبانیں بولتی تھیں۔گوجری زبان چھٹی صدی عیسوی میں پراکرتوں کے ظہور کے نتیجے میں گجرات میں پیدا ہوئی۔وسطی ہند کی شورسینی پراکرت سے برج بھاشا کے دھارے پھوٹے اور اس کی شاخ اپ بھرنش سے گوجری نے جنم لیا۔''

آگے سید ظہور الدین مدنی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''گوجروں کی زبان ہر جگہ گوجری ہی ہے۔گوجری برصغیر کی واحد زبان ہے، جو ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔گجرات کے بعد گوجری کا لسانی اثر سب سے زیادہ دکنی پر ہوا۔اس کے علاوہ میواڑی راجستھانی، پنجابی، سندھی اور نیپالی پر گوجری کا اثر مسلم ہے۔امیر خسرو (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۲ء) نے گوجریکو ایک مستقل اور معروف زبان قرار دیا، اور خود بھی گوجری میں شاعری کی ، جسے ہم کلاسیکی اردو کہہ سکتے ہیں۔امیر خسرو کا یہ شعر دیکھئے۔

''گوری سووے سیج پہ، مکھ پہ ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے ، سانجھ بھئی چوندیس ''

خطہ پیر پنچال کے چند اہم گوجری کے شعرا کا تذکرہ کیا جائے تو ان میں نون پونچھی، چودھری خدا بخش زار، چودھری محمد اسرائیل مہجور، چودھری محمد اسرائیل اثر، چودھری حسن دین حسنو دھری فتح علی سروری کسانہ، رانا فضل حسین راجوروی، چودھری نذیر احمد نذیر، ڈاکٹر صابر آفاقی، اقبال عظیم چودھری، چودھری مخلص وجدانی، چودھری ابرار احمد ظفر، چودھری غلام سرور صحرائی، چودھری سرور حسین طارق، چودھری نسیم پونچھی، ودھری محمد منشا خاکی، ڈاکٹر رفیق انجم، شمس الدین مہجور پونچھی، مولوی علم دین بن باسی، مولانا محمد اسمائیل ذبیح، میاں نظام الدین لاروی، محمد رفیق سوز، ڈاکٹر جاوید راہی، رفیق بھٹی، نور احمد نور، ریاض صابر، ایاز سیف، ڈاکٹر مرزا خاں

وقار، گلزار احمد گلزار، سید مظفر حسین شاہ، چودھری نذیر حسین فدا، ذاکر حسین فیاضی، کرشن کمار، الحاج چودھری محمد علی بیتاب، محمد شوکت، چودھری نثار حسین راہی، محمد یٰسین، قاسم شمیم، محمد قاسم بحرانو غیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بھی چند پر مختصر گفتگو کروں گا۔

ڈاکٹر مرزا خان وقار کو گوجری ادب کا پریم چند کہا جاتا ہے۔ انہوں نے جہاں اپنے بہترین اور لازوال افسانوں سے گوجری ادب کو مالا مال کیا ہے، وہیں گوجری شاعری میں بھی امکانات روشن کئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ پہلے گجر بکروال ہیں جنہوں نے پروفیسر ہونے تک کا سفر کیا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ ان کی دکھائی روشنی سے دوسرے بھی متوجہ و مستفیض ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہمالین ایجوکیشن مشن کے صدر دفتر میں ان سے گفتگو ہو رہی تھی تو انہوں نے بتایا تھا کہ ''جاوید صاحب، میں یہاں کا پہلا گجر بکروال ہوں جو پروفیسر ہوا۔'' میری ظرافت والی حس بھی یکا یک بیدار ہوئی، اور میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا'' وقار صاحب اس سے بڑھ کر ایک کرامت یہ ہے کہ آپ ایک جگہ اتنے سالوں تک ٹک گئے، ورنہ گجر بکروال اور اپنی صحرا نوردی ترک کر کے ایک جگہ سکونت اختیار کر لے، یہ اب تک تو ناممکنات میں سے تھا۔'' ان کے دو گوجری اشعار بغیر اردو ترجمہ کے پیش ہیں، جس میں وژن اور بحور کا بھی اہتمام ہے۔

ہوٹھیں ہا سا سجا کے رکھیا
داغ دل کا چھپا کے رکھیا
میری بند مٹھی نہ کھولئے
بھرم گھر کا میں دبا کے رکھیا

ڈاکٹر رفیق انجم کے دو گوجری اشعار اور ان کا اردو ترجمہ ذیلمیں درج ہے۔

آنوں بار نہ آیا اتھروں
کس کس نے سجھایا اتھروں
خالی دیکھ حویلی دل کی
اس نے آن بسایا اتھروں

اردو ترجمہ:

میرے آنسو ٹپکنے سے باز نہیں آئے
عجیب بات ہے کہ ان آنسوؤں کو کس کس نے سمجھایا کہ وہ نہ ٹپکیں
میرے دل کی حویلی جب خالی نظر آئی
اس کو آباد کرنے کے لئے آنسو آکر مکیں ہوئے

بابو نور محمد نور کی ایک گوجری غزل بھی دیکھی جائے۔

میرا دل کا خواباں ،خیالاں کی رانی
توں کیوں چپ ہے دستی نہیں اپنی کہانی

تیرو کم جلانو میرو غم کھانو
توں خوشحال میری اکھاں ماںھ پانی

کدے دل ترسے کدے دئے تسلی
بڑھاپو ہے یوہ یا کہ چڑھتی جوانی

ہویا جگ ماںھ عاشق ہزاراں کروڑاں
گئی مک نہ اجتک عشق کی کہانی
تیری دوستی تھی کہ چھولاں کو بڈھ تھو
گیا مک سارا زبانی زبانی

ڈوگری اور پنجابی زبانیں بھی، جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس خطے میں بولی جانے والی اہم علاقائی زبانیں ہیں۔ ان پر گفتگو انشاءاللہ آئندہ کتب میں کروں گا۔ فی الوقت ڈوگری زبان کے ایک اہم شاعر اوم پرکاش کے دو شعر اور اس کے اردو ترجمے پیش کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

میرا بلغے داتند اپیار
دوریں دے پرو یسا اے
کرداگی آوے زار
دوریں دے پرو یسا او

اردو ترجمہ:

تیرا پیار مجھے انتظار میں رکھے ہوئے ہے
تو کس پردیس چلا گیا ہے
مجھے ہر وقت بیمار کر کے رکھا ہے
دع پردیس جانے والے دوست ،تونے

چھتہ پانی پیرگلی

دھدری مندر راجوری
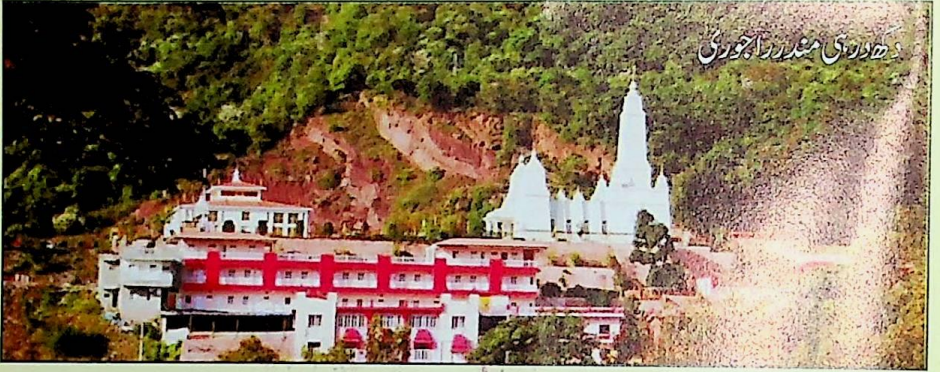
پونچھ قلعہ
POONCH FORT

شاہدرہ شریف راجوری

بڈھا امرناتھ پونچھ

گرودوارا راجوری
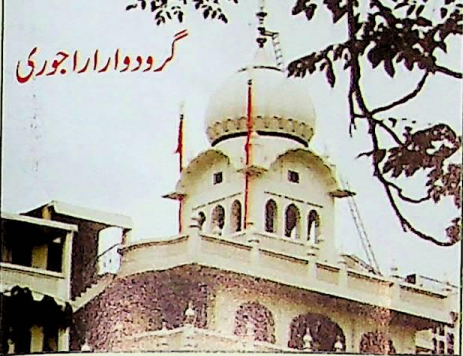
راجوری شہر
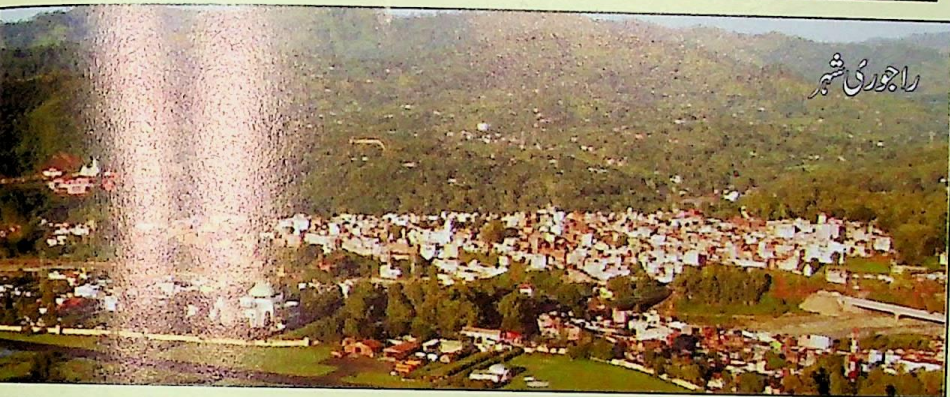
جامع مسجد راجوری
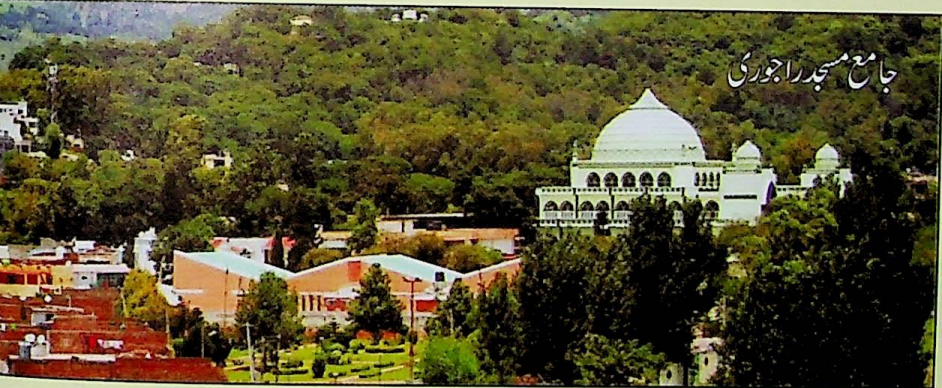
پیر پنچال کی سب سے اونچی پہاڑی ڈگیار پیک (۱۵۲۹۰ فٹ)